قومی زبان

انجمن ترقیِ اُردُو
بابائے اُردُو روڈ۔ کراچی

ماہنامہ

قومی زبان

کراچی

نومبر ۱۹۸۸ء
جلد ۵۹
شمارہ ۱۱

مضمون نما

اردو تدریس کے مسائل		۳
نوادر کتب خانۂ خاص	ڈاکٹر اسلم فرخی	۵
بے حوالہ ہوئی یاد	مجنوں گورکھپوری	۹
یک تحریر	ابو الحسن ہمدانی	۱۳
فکر اقبال کا ایک اہم پہلو	ڈاکٹر صابر حسین جلیسری	۱۹
جبن کے شری افکار	ضیاء الرحمٰن صدیقی	۲۵
بیدی کی ایک کہانی	آصف فرخی	۲۹
ناگفتہ	راجندر سنگھ بیدی	۳۱
خود نوشت	راجندر سنگھ بیدی	۳۵
اندیشۂ گرمی	سلیم الرحمٰن	۳۷
آب حیات اور طنز و مزاح	رام لعل	۴۳
کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ	ڈاکٹر انور سدید	۵۱
یوسف ناظم سے ایک مکالمہ	طاہر مسعود	۵۷
موں کی رکھ	رشید امجد	۶۳
گاہائے رنگ رنگ		
نظمیں		
میرے ناخجی لیے چل مدینے مجھے	قاضی نذر الاسلام / افسر ماہ پوری	۶۷
ایک نظم	چیڈ لوک تک پورن / یعقوب لطیف	۶۸
بیٹے کی سالگرہ پر	اے ایل خطیب / ادیب سہیل	۷۰
وہ شہری جن کا کوئی ملک نہیں	محمود درویش / قیصر سلیم	۷۱
خداداد	رشید بھٹی / آفاق صدیقی	۷۶
رفتارِ ادب		۸۱
گرد و پیش		۸۶
حروف تازہ		۸۹
نئے خزانے	ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری	۹۲

ادارۂ تحریر

جمیل الدین عالی
ادا جعفری
ڈاکٹر اسلم فرخی

مدیر معاون
ادیب سہیل

بدل اشتراک
فی پرچہ .... ۵ روپے
سالانہ .... ۵۰ روپے
سالانہ (رجسٹری سے) ..... ۱۰۰ روپے

بیرون ملک
فی پرچہ ..... ایک ڈالر
سالانہ ..... دس ڈالر
سالانہ (رجسٹری سے) ..... پندرہ ڈالر

انجمن ترقی اردو پاکستان
بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱ فون: ۷۲۴۰۲۳

اُردو تدریس کے مسائل

ہمارے بعض لائق احباب نے اردو سیکھنے کے سلسلے میں بچّوں کی مشکلات کی طرف توجّہ دلائی ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اردو کی درسی کتابیں بچّوں کی استعداد اور ذہنی صلاحیت کے مطابق مرتب نہیں کی جارہی ہیں۔ انھوں نے بیان کیا ہے کہ کے۔ جی کلاس کی کتاب کا پہلا سبق "حمد" ہے جس میں چالیس پچاس مشکل الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ دوسرے سبق میں چالیس پچاس نئے مشکل الفاظ پھر استعمال ہوئے ہیں اور پہلے سبق اور پہلے سبق کے مشکل الفاظ دہرائے نہیں گئے۔ پوری کتاب کا انداز یہی ہے۔ بچّے کو سادی کتاب پڑھنے اور سمجھنے میں بڑی دقّت ہوتی ہے۔ اس قسم کی درسی کتابوں سے اردو زبان کی مقبولیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔

تحریر میں بھی اسی قسم کی دقّتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بچّوں کو حروف کے جوڑ بٹھانے میں دقّت محسوس ہوتی ہے اور اس کے لیے مناسب طریقہ وضع کرنا ضروری ہے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بچّوں کے سرسری مطالعہ کے لیے اچھی، مفید اور دل چسپ کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ انگریزی میں تو ہر عمر کے بچّوں کے لیے سرسری مطالعہ کی کتابیں موجود ہیں جن کو بچّے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں لیکن اردو میں دیو اور پریوں کی فضول اور بے معنی داستانوں کے علاوہ ڈھنگ کی کتابیں نہیں ملتیں۔ اس طرف توجّہ کرنے کی ضرورت ہے جس سے بچّوں کی ذہنی اور لسانی استعداد میں مناسب اضافہ ہو۔

یہ ایک دردمند شخص کے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی روداد ہے اور اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔ ابتدائی درسی کتابوں میں الفاظ شماری کے اصولوں کو قطعاً مدِّ نظر نہیں رکھا جاتا اور نہ اس بات کا لحاظ کیا جاتا ہے کہ پوری کتاب میں جو الفاظ استعمال ہوں وہ ایک مقررہ تعداد کے پابند ہوں۔ ابتدائی درسی کتابوں میں تعلیم کے اس بنیادی نکتے کو مدِّ نظر نہ رکھنے سے بچّے کو بے شمار نئے الفاظ بہ یک وقت یاد کرنا پڑتے ہیں جس کی وجہ سے اس کے ذہن پر بے کار بوجھ پڑتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ابتدائی جماعتوں کے لیے اردو کی جو درسی کتابیں تیار کی جائیں۔ ان میں الفاظ شماری کے طریقے کو مدِّ نظر رکھا جائے اور بچّے کو نئے الفاظ سے بتدریج آشنا کیا جائے۔ ملک کے چاروں صوبوں میں درسی کتابوں کے بورڈ موجود ہیں انھیں درسی کتابوں کی تیاری میں اس اصول کو پیشِ نظر

لانا چاہیے۔ آج کے دور میں درسی کتابوں کی تیاری ایک سائنٹفک ضابطہ کی پابند ہے جس میں بچوں کے سیکھنے کی قوت میں بتدریج اضافہ کیا جاتا ہے اور مناسب منصوبہ بندی سے کام لیا جاتا ہے۔

سرسری کتابوں کی اشاعت کا مسئلہ بھی بڑا اہم ہے، اگرچہ یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ بچوں کے لیے لکھنا بڑوں کے لکھنے کے مقابلے میں بہت مشکل ہوتا ہے تاہم اگر مناسب توجہ کی جائے تو بچوں کے ادب میں خوش گوار اضافہ ممکن ہے۔ ملک کے بعض مقتدر ادارے بچوں کے ادب کی اشاعت میں کوشاں ہیں لیکن یہ کام صرف چند اداروں کا نہیں ہے بلکہ پوری قوم کی ذمہ داری ہے۔ اگر ہم اپنی نئی نسل کی نشوونما، ذہنی تربیت اور صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کی بھرپور کوشش نہیں کریں گے تو یہ ہمارا اپنا ہی ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔

انجمن ترقی اردو اگرچہ علمی اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت کرتی رہتی ہے تاہم بچوں کا بہتر ادب پیش کرنے کے لیے اس کی خدمات حاضر ہیں۔ ہم نے بچوں کے ادب کے سلسلے میں پہلے بھی بعض کتابیں پیش کی ہیں۔ اب بھی ہم اس خدمت کے لیے تیار ہیں۔

ہمارے احباب نے جن دقتوں کا اظہار کیا ہے ان کے بارے میں، وزارتِ تعلیمات اور صوبائی درسی کتابوں کے بورڈ کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ درسی کتابوں کی تیاری قومی ترقی کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ اگر ہم نے اس میں تساہل یا تغافل برتا اور علمی تقاضوں، نئے رجحانات اور اپنی قومی ذمہ داری کو محسوس نہ کیا تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔

ہم درسی کتابوں کے مرتب کرنے والوں اور ماہرینِ تعلیم کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ ان دقتوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں اور اس مسئلے کے حل کے لیے مناسب رہنمائی فرمائیں۔ "قومی زبان" کے صفحات اس خدمت کے لیے حاضر ہیں۔

پاکستان کی کہانی

دادی امّاں کی زبانی

مصنّفہ

سلمیٰ زمن

صفحات: ۶۴ ——— قیمت: ۱۵ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی ۱

نوادرِ کتب خانۂ خاص

لارڈ بیکن

اس کے حالاتِ زندگی اور اس کا فلسفہ

مصنّفہ

مولوی محمد عبدالستّار صاحب فرنگی محلی مرحوم و مغفور

مرتّبہ

مولوی عبدالحلیم صاحب شرر، ایڈیٹر "دلگداز"

مولوی عبدالحلیم شرر اردو ادب کی تاریخ میں اپنے ناولوں اور انشا پردازی کی وجہ سے ممتاز و معروف ہیں۔ ناول نگاری اور انشا پردازی ان کی علمی و ادبی شخصیت کا صرف ایک پہلو ہے۔ بنیادی طور پر وہ تاریخ اور معقولات کے عالم تھے۔ تاریخ، فلسفۂ تاریخ اور فلسفے پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ تاریخ کے سلسلے میں انھوں نے بعض بڑے قابلِ قدر کام انجام دیے ہیں۔ تاریخِ بنی اسرائیل، تاریخِ سندھ۔ گزشتہ لکھنؤ اور بے شمار دوسری کتب و مضامینِ تواریخ ان کے کمالاتِ علمی کے یادگار ہیں۔ شرر مشرقی ماحول میں پرورش پانے کے باوجود استفادۂ مغرب کے بہت قائل تھے۔ سرسیّد احمد خاں کی طرح انھیں بھی یہ احساس تھا کہ مغربی فکر اور علوم و فنون سے استفادے کے بغیر زندگی کے نئے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں لیکن وہ مغربی فکر اور علوم و فنون سے مرعوب نہیں تھے بلکہ علومِ مشرق کے امتزاج سے انھیں اپنے لیے زیادہ قابلِ قبول اور کارآمد بنانے میں کوشاں رہے۔

تاریخ کی طرح شرر کو فلسفے سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے معقولات کا مطالعہ بڑی توجّہ سے کیا تھا اور اپنے عہد کی مغربی فکر سے بھی آگاہی حاصل کی تھی لیکن ان کا خیال یہ تھا کہ "فکر و خیال کو عملی دنیا سے وابستہ ہونا چاہیے اس سے انسانی تمدّن کو فائدہ پہنچے اور دماغِ انسانی کی حکومت وسیع ہو۔" قدیم فلسفیوں کی طرح غلط استقرا میں اپنی صلاحیت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ فلسفے اور زندگی میں بُعد کے تصوّر سے بے اختیار علّامہ اقبال کا مصرع "ہے فلسفہ زندگی سے دوری" ذہن میں آتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علّامہ فلسفے کے اس رُخ سے پوری طرح آگاہ تھے۔

شرر نے مغربی فکر کو عام کرنے اور فلسفہ و زندگی میں مطابقت تلاش کرنے کی غرض سے یہ کوشش کی کہ لارڈ بیکن کے حالات اور کارنامے اردو میں قلم بند ہو جائیں اور آسان و سلیس زبان میں ایک ایسی کتاب تیار ہو جائے جس سے عام قاری بھی فائدہ اٹھا سکے۔ مولوی محمد عبدالستار فرنگی محلی نے اس کام کا ذمہ لیا اور میکالے کی لائف آف بیکن کو اردو میں منتقل کرنا شروع کیا۔ لیکن کام مکمل نہ ہو سکا اور مولوی محمد عبدالستار اچانک وفات پا گئے۔ مولوی صاحب کے انتقال کے بعد یہ کام معرضِ التوا میں رہا تا آنکہ شرر کو اس کی تکمیل کا خیال آیا اور جو حصہ ترجمہ ہونے سے باقی رہ گیا تھا اسے انھوں نے خود مکمل کر کے کتاب شائع کر دی۔

"لارڈ بیکن" ایک دلچسپ اور مفید کتاب ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں شرر نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ آج بھی بہت اہم اور معنی خیز ہیں۔ شرر لکھتے ہیں: "ہندوستان کا موجودہ زمانہ ایک نہایت ہی ناقص حالت میں ہے۔ پرانے خیالات۔ پرانے علوم اور پرانی باتوں کی وہ اگلی کامیابی باقی نہیں رہی اور نئے علوم نے ہنوز اچھی طرح فتح نہیں پائی۔ جو لوگ پرانے مذاق کی پابندی کا دعویٰ کرتے ہیں ان کے اخلاق و عادات میں جدید تہذیب کی بہت سی باتیں داخل ہو گئی ہیں اور جو جدید تہذیب کے دلدادے ہیں ان سے ابھی بہت سے پرانے مذاق اور پرانے رنگ کی باتیں نہیں چھوٹیں۔ لہٰذا موجودہ ہندوستان ایک عجیب گومگو کی حالت میں پڑا ہوا ہے۔ نہ اِدھر میں ہے نہ اُدھر میں۔ ایسے نازک وقت اور ایسی خطرناک حالت میں ایک ایسے رسالے کا پیش کر دینا جو صاف طور پر اور وضاحت کے ساتھ بتا دے کہ فلسفۂ قدیم اور فلسفۂ جدید یا اگلے اور پچھلے تمدن میں کیا فرق ہے، نہایت ضروری ہے۔"

اسی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے شرر لکھتے ہیں۔ "انگریزی تہذیب اور یورپین علوم کو ہندوستان پر حکومت کرتے ہوئے تقریباً سو برس گزر گئے۔ اگرچہ دارالعلوم اور یونیورسٹی کی بنیاد بعد میں پڑی مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزوں سے ملنے جلنے۔ ان کے اخلاق و عادات کے حاصل کرنے اور برتنے سے پیشتر ہی اکثر لوگ انگریزی علوم و یورپین معاشرت کے دلدادہ ہو گئے تھے۔ باوجود اس کے اردو زبان میں کوئی ایسی خاص تصنیف نہیں موجود ہے جو بہت ہی سلجھا کے اور بڑی صفائی کے ساتھ بتا دے کہ فلسفۂ قدیم و جدید میں کیا فرق ہے۔ کچھ پرانے مذاق والوں ہی کو الزام نہیں دیا جا سکتا کہ جدید علوم کی برکتوں اور خوبیوں سے ناآشنا ہیں۔ بلکہ موجودہ علوم سیکھنے والے بھی بالکل نہیں جانتے کہ فلسفہ و منطق کا قدیم مذاق کیا تھا ــــ ہمارے علما و فضلا جن کے ہاتھ میں دینی اور قومی تعلیم کی باگ ہے۔ اگر اس رسالے کو ملاحظہ فرمائیں گے اور غور سے پڑھیں گے تو ہمیں امید ہے کہ نئے خیال کے عالموں اور نئے اسکول کے طالب علموں سے اتنے ناآشنا نہ رہیں گے جتنے کہ فی الحال ہیں۔"

شرر نے بیکن کے "اسیز" کا ترجمہ بھی اردو میں شائع کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ لیکن وہ اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

بہرحال لارڈ بیکن کے حالاتِ زندگی اور اس کے فلسفے کے بیان سے شرر کی روشن خیالی۔ ان کی علمی اور قومی تڑپ۔ تعلیمی امور سے ان کی گہری دلچسپی اور ذہن کو وسعت دینے کی شدید خواہش کا اندازہ ہوتا ہے۔

شرر نے ۱۹۰۰ء میں ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ۸۸ برس گزر جانے کے باوجود عملی سطح پر قدیم و جدید میں وہ مفاہمت پیدا نہیں ہو سکی جو شرر کا مطمحِ نظر تھی۔ دونوں آج بھی ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے۔ دونوں کے امتزاج سے نئی اور بہتر صورتِ حال وجود میں نہیں آ سکی۔

لارڈ بیکن کی زبان بہت صاف اور سادہ ہے۔ بیکن کے خیالات اور نظریات کی توضیح بڑے سادہ اور دل نشین انداز میں کی گئی ہے۔ کہیں کوئی الجھاؤ نہیں۔ بڑے بڑے مشکل مباحث کو بڑی آسانی اور سادگی سے بیان کیا گیا ہے۔ پیچیدہ علمی بحثوں کو اتنے سلیس انداز میں پیش کرنا نثر کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یہ نئے لکھنے والوں کے لیے ایک مفید، فعال اور نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ موضوع کتنا ہی دقیق اور پیچیدہ کیوں نہ ہو لیکن اگر لکھنے والے کو اس پر عبور حاصل ہے تو اس کی توضیح و تشریح میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔

اسی صفحے کی یہ کتاب آج بھی دل چسپی سے پڑھی جا سکتی ہے۔ ہم نے مغرب کے علمی خزانوں کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں آج بھی مصروف ہیں۔ نثر کا یہ رسالہ اس سلسلے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ترجمے کی عظمت اس سے ظاہر ہوتی ہے۔

لارڈ بیکن ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی تھی طبع اوّل ۶۰۰ کتابوں پر مشتمل تھی۔ غالباً یہی اس کی طبع آخر بھی تھی۔ لارڈ بیکن کے نسخے عام طور پر دست یاب نہیں ہوتے۔ اس کی کمیابی اور مثالی حیثیت نے اسے نوادرِ کتب خانۂ خاص کا حصّہ بنا دیا ہے۔

حرفے چند

از

جمیل الدّین عالی

زیرِ طبع

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ، کراچی ۱

مجنوں گورکھپوری

ایک بھولی ہوئی یاد

مجنوں گورکھپوری کی ایک یادگار تحریر

آج بالکل اتفاق سے "تذکرۃ الخواتین"، مصنفہ عبدالباری آسی کی ایک جلد پہ میری نگاہ پڑ گئی جس کو اس سے پہلے میں نے دیکھا نہیں تھا اور نہ دیکھنے کا شوق تھا۔ میں یوں ہی بلاارادہ اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ صفحہ ۱۸ پر "ظریفہ" کے ذکر میں اس غزل پر میری نگاہ رک گئی اور اس نے مجھے ایک بھولا ہوا زمانہ یاد دلا دیا۔

بہتر تو یہی تھا کہ مجھے پیار نہ کرتے　　کرتے بھی تو رسوا سر بازار نہ کرتے
میں آپ دکھاتی تمہیں سو رنگ کے جلوے　　تم حسرتِ دیدار کا اظہار نہ کرتے
جذبات کی رَو میں مجھے معبود بنا کر　　اے کاش تم اپنے کو گنہگار نہ کرتے
دل ہی میں چھپا رکھتے اگر رازِ محبت　　اس دکھ کا علاج آپ ہی دشوار نہ کرتے
دیوانگیٔ عشق ہے سرمایۂ راحت　　تم پھول میں پیدا خلشِ خار نہ کرتے
منظور نہیں مجھ کو تنک ظرفیٔ منصور　　دنیا پہ عیاں حالِ دلِ زار نہ کرتے
اتنا بھی نہ تھا مادۂ ضبط جو تم میں
بہتر تو یہی تھا کہ مجھے پیار نہ کرتے

آسی صاحب اس کے بعد لکھتے ہیں "یہ غزل "نذرِ عشق" کے عنوان سے "آئینہ" اگست ۱۹۲۳ء میں چھپی تھی، تلمیح طلب معلوم ہوتی ہے "مگر" محتسب را درونِ خانہ چہ کار"

مجھے اب سے گیارہ برس پہلے کا زمانہ یاد آگیا، جبکہ میرا ادبی ولولہ جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا اور میں بڑی سرگرمی اور حوصلہ کے ساتھ "ناہید" نامی ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کی فکر میں کھانا پینا بھولا ہوا تھا۔ نہیں کہہ سکتا کہ "ناہید" اگر نکلتا تو اس کا کیا مرتبہ ہوتا اور اس کو حسرت الآخر کیا ہوتا۔ مگر اب جبکہ وہ نہیں نکلا تو میں کہوں گا کہ وہ ایک تخیلی اکتساب ہوتا۔

چو وسعتِ عدمم در خیال می آید　　ز تنگنائے وجودم ملال می آید

خیرا! "ناہید" کی خبر میرے بعض کالج کے دوستوں نے ہر طرف اور بالخصوص لکھنؤ میں بہانگ دہل مشہور کر رکھی تھی اور میرے

پاس بعض مضامین نظم و نثر کے چند لفافے آ چکے تھے۔ ایک لفافہ کو کھولا تو وہ اسی "ظریفہ" کا تھا جو لکھنؤ سے آیا تھا۔ اس میں ایک تو یہی "نذرِ عشق" تھی جو اس سے پہلے "آئینہ" میں میری نظر سے گزر چکی اور مجھے زبانی یاد ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل چیزیں بھی تھیں۔

یہ دو اشعار جو "آئینہ" میں چھپ چکے تھے:

ابھی تو طفلِ دبستاں ہو تم کو کیا معلوم — وفا وفا نہ کرو دہر میں وفا معلوم
جو کہہ رہا ہے دوائیں نہ کارگر ہوں گی — اسی کو خوب مرے دکھ کی ہے دوا معلوم

مجھے کل کی طرح یاد ہے کہ امتیاز کے ساتھ میں ہفتوں ان اشعار پر سر دُھن چکا ہوں۔ ہم لوگوں نے بہت زور لگایا کہ مطلع کا پہلا مصرع کسی طرح بدل دیا جائے صرف اس لیے کہ "طفلِ دبستاں" ایک عورت کی زبان سے کھٹک رہا تھا، لیکن مصرع اپنی جگہ اٹل رہا اور جب ہٹتا تھا تو شعر کا آہنگ بگڑ جاتا تھا۔ ان کے علاوہ میرے خط میں جو اشعار درج تھے وہ غالباً غیر مطبوعہ تھے۔ اس لیے کہ میری نظر سے کہیں گزرے نہیں۔ ایک تو خسرو کی غزل کے تین اشعار پر خمسہ تھا۔ دو میں فارسی مصرعے لگائے گئے تھے اور تیسرے میں اردو۔ یہاں لکھنے والی کی نرالی آن بان ہے۔ بالخصوص فارسی اشعار میں۔ اردو میں وہ بے ساختگی اور روانی پیدا نہیں ہو سکی۔

چہ شد اے جذبِ کامل باز نامد — چرا حل کردہ مشکل باز نامد
بہ شاہے رفتہ سائل باز نامد — صبا آمد ولے دل باز نامد
غریبِ ما بہ منزل باز نامد
بگویم قصۂ اندوہ گینے — خرابم در خیالے مہ جبینے
نہ دنیائے ہمیں دارم نہ دینے — دلِ من رفت با محمل نشینے
رود جاں ہم چو محمل باز نامد
تلافی محنتوں کی تھی ضروری — کہاں تک منزلِ مقصد سے دوری
ہوئی حاصل نہ جب تیری حضوری — بدریا غرق شد رختِ صبوری
چو کشتی سوئے ساحل باز نامد

ان اشعار کی کیفیت کا وہی شخص اندازہ کر سکتا ہے جس کے دل میں خود کوئی کیفیت موجود ہو۔ میں نے اکثر اہلِ ذوق کے سامنے ان اشعار کو پڑھا ہے اور وہ دم بخود رہ گئے ہیں۔

آخر میں یہ اشعار تھے۔

دل لینے کی باتیں تھیں سب دل دے کر سب جان گئی — جاؤ بہت باتیں نہ بناؤ، جاؤ تمہیں پہچان گئی
آپ سراپا صدق و صفا ہیں آپ مجسّم عشق و وفا — دُھن کے پورے بات کے پکے مان گئی ہاں مان گئی

میں اس پُر اسرار ہستی کو عرصہ سے بھولا ہوا تھا۔ لیکن آج آسی کے تذکرہ نے اس کی یاد تازہ کر دی اور میں نے ڈھونڈھ کر

اس کا خط نکلا اور وہ ہستی کوئی بھی ہو مگر ہے بڑی مٹی ہوئی۔ میں نے صرف ایک بار اس کا پتہ لگانے کی کوشش کی۔ اتنا تو اُس کے خط میں لکھا تھا کہ وہ لکھنؤ میں عورتوں کے کالج میں پڑھتی ہیں "ظریفہ" والدین کے درمیان تھا اس لیے غالباً اس کا اصلی نام یہ نہ تھا! اس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ شاید لکھنؤ چھوڑ کر الٰہ آباد چلی گئی ہے۔ ۱۹۲۵ء ۱۹۲۶ء میں اپنے الٰہ آباد کے قیام میں میں نے اس کی تلاش کی مگر مجھے سخت ناکامی ہوئی۔ آسی بھی اس بارے میں عاجز رہے اور اس کا نام ونشان نہ جان سکے۔ ایسی ہستی کا روپوش رہنا اور پھر یک قلم غائب ہو جانا بے انتہا عبرتناک ہے۔ میں عورتوں کی شاعری اور ادبیت کا کچھ زیادہ قائل کبھی نہیں رہا۔ لیکن اگر کوئی عورت ایسے شعر کہہ سکے تو اس کو صرف شاعری کرنا چاہیئے۔

جو اشعار پیش نظر ہیں ان سے ایک بات کا تو بہت صاف پتہ چلتا ہے۔ یعنی یہ عورت بے انتہا مختصر گو واقع ہوئی ہے اور یہ دلیل ہوتی ہے جذبات کی واقعیت اور ان کے خلوص کی جو کبھی طوالت اور تکلف کی تاب نہیں لا سکتے۔ بیان میں جو سادگی اور سہولت پائی جاتی ہے وہ بھی اسی طرف اشارہ کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی ہستی نے اگر زندہ رہتے ہوئے شعر کہنا چھوڑ دیا ہے تو اس نے یقیناً اپنی فطرت پر بہت بڑا ظلم کیا۔ ایک بات کسی قدر حیرت انگیز ہے۔ "نذر عشق" میں جو پندار غرور حسن پایا جاتا ہے۔ اس کا نشان بھی دوسرے اشعار میں نہیں ہے۔ اس سے صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے۔ "نذر عشق" کو تقدم زمانی حاصل ہے اور وہ اس دور سے پہلے کی چیز ہے جس کو شکستگی اور رنجوری کا دور کہنا چاہیئے۔ لیکن اس دور کے جو اشعار معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں شعریت بہت زیادہ ہے۔ میں اس تذکرہ کو نہ بڑھانا چاہتا تھا اور نہ بڑھانے کے سامان مہیا رکھتا۔ اتنی خواہش ضرور ہے کہ اگر کسی کو اس عورت (جس کو کسی طرح ظریفہ کہہ کر پکارنے کو جی نہیں چاہتا) کا نام ونشان معلوم ہو تو وہ مجھے مطلع فرمائیں۔ میں ان سے کچھ اور حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اور اگر ان کی نظر سے یہ مضمون گزرے تو مجھے اپنا پتہ دینے میں تامل نہ کریں، یہی نہیں بلکہ ایوان کے لئے کچھ اور کلام بھیجیں۔

چلتے چلتے میں ایک اور خیال کا بھی اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ اگر یہ عورت افسانے لکھنا شروع کر دے تو شاید بہترین فسانہ نگاروں میں ہو جائے۔ مگر پھر خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے جذبات کی انتہائی واقعیت شرح وبسط کی اجازت نہ دے اور فسانہ میں شعر کے مقابلہ میں زیادہ شرح وبسط تو ماننا ہی پڑیگا۔ بہرحال مجھے اس عورت کا پتہ درکار ہے۔

پاکستان میں اردو تحقیق

از

ڈاکٹر معین الدین عقیل

قیمت: ۳۰ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان بابائے اُردو روڈ۔ کراچی

ابنِ حسن برنی (مرحوم)

ایک تحریر

[ستمبر ۸۸ میں امریکہ سے واپسی پہ ایک مہینہ لندن رُکا۔ اس بار رفیقِ دیرینہ ابنِ حسن برنی سے گلے نہیں لگ سکتا تھا۔ وہ دمکتے ہوئے چہرے اور شفیق مسکراہٹ سے میرا استقبال کرنے کے لیے میرے پاس نہیں آسکتے تھے۔ میں ان کی آخری آرام گاہ پر گیا اور اللہ تعالیٰ کی خدمت میں عرض کیا کہ ان کے مراتب بلند کرے۔ آمین۔

ان کی رفیقۂ حیات بیگم ارجمند برنی اسی طرح شفقت سے پیش آئیں۔ نم آنکھوں سے ہم عمرِ رفتہ کو آواز دیتے رہے۔
برنی صاحب کی ایک تحریر انھوں نے عنایت کی جو قارئین کی نذر ہے۔ مجھے ان کی ادبی تحریروں کا علم نہیں تھا۔]

نورالحسن جعفری

تعلیم سے فارغ ہوا تو والد صاحب کی رائے ہوئی کہ میں ان کے نقشِ قدم پر چلوں۔ وطن میں قیام کروں۔ وکالت کروں اور اپنے لکھنے پڑھنے کے شوق کو جاری رکھوں۔ تجویز اچھی تھی۔ والد صاحب شہر کے سب سے بڑے وکیل تھے۔ خود ان کی لائبریری میں تاریخ، فلسفہ، علم، ادب، مذاہب اور طرح طرح کے جدید علوم پر بیس پچیس ہزار کتابیں تھیں۔ گھر میں بلکہ سارے خاندان میں علم کا چرچہ تھا۔ علم و فضل اور شرافت اور وضع داری زندگی کی پسندیدہ قدریں سمجھی اور اختیار کی جاتی تھیں۔ صدیوں پہلے ہمارے جدِ امجد یہاں کے افسرِ اعلیٰ مقرر ہو کر آئے تھے اور اسی وقت سے خاندان کا یہاں قیام تھا۔ میں نے کچہری جانا شروع کیا۔ مجھے وہاں کا ماحول پسند نہ آیا اور وکالت میں دل نہ لگا۔

اس زمانے کے دستور کے مطابق میں نے بھی مقابلہ کے امتحانات کی تیاری شروع کر دی۔ ایک دن کسی کام سے ڈک گیا سوچا کہ نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب سے بھی ملتا چلوں۔ وہ عبوری حکومت میں وزیر تھے۔ انھوں نے محمد علی حبیب صاحب کا ذکر کیا۔ بتلایا کہ وہ پاکستان کے لیے نوجوان BANKERS تیار کر رہے ہیں اور مجھے حبیب بنک منتقل کرنے کی ترغیب دی۔ اور ایک بہت اچھا TESTIMONIAL بھی دے دیا۔ میں نے عرضی دے دی۔ اور لے لیا گیا۔ میرے REFEREES میں والد صاحب کے دو ہم جماعت غلام محمد صاحب اور زاہد حسین صاحب کے نام تھے مگر میں ان سے کبھی نہ ملا۔

ستمبر ۴۷ء میں بمبئی میں ملازمت شروع کی۔ نومبر میں سیٹھ صاحب مجھے اپنے ساتھ ایک چارٹرڈ پلین میں کراچی لے آئے۔ کراچی میں قدم رکھتے ہوئے میں نے اپنے دل میں کہا کہ ہم وطنِ عزیز میں BANKING دیانت، محنت، مہارت، ہمت، محبت، اور خدمت کے ساتھ کریں گے اور وطن، اہلِ وطن کی بہبودی کے لیے ہر دم کوشاں رہیں گے۔ اپنے لیے میں نے سوچا کہ جو زادِ راہ ماں باپ نے شرافت و وضع داری اور سلوک و انکساری کا ساتھ کر دیا ہے اسے ضائع نہ ہونے دوں گا۔ ممکن ہے کہ خیالات خالص جذباتی ہوں کیوں کہ اس وقت میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری تھے۔ مگر میں ان لمحات کو نہ بھولا۔

عجیب امنگوں کا زمانہ تھا۔ کوئی کام اجنبی اور دشوار نہ لگتا تھا۔ غیب سے راہیں کھلتی تھیں۔ اچھے بننے اور اچھے کام کرنے کو دل چاہتا تھا۔ سب اپنے لگتے تھے، اپنے کام آتے تھے۔ ہر شہر میں شاخیں کھولنے کی لگن تھی۔ جب ایجنٹ بنا تو دل چاہتا تھا کہ کسی طرح برانچ شہر بھر کے لیے فیض رساں ہو جائے۔ اوکاڑہ میں بیٹھ کر پاکستان کی پہلی کپاس کی فصل کے لیے کافی ذرائع فراہم کیے۔ منٹگمری میں بینکنگ کا دروازہ عوام کے لیے بھی عام کیا۔ سکھر کی برانچ چلانا تھا کہ بوریوالہ ٹیکسٹائل ملز کا جنرل منیجر مقرر ہو گیا۔ کام کا نہ کوئی اندازہ، نہ تجربہ۔ مسائل اور دشواریاں ہزار۔ باون ہزار تکلوں کی بھاری مشینری ایک میدان میں بارش کے رکے ہوئے پانی میں ڈوبی کھڑی۔ روز شکایتیں کہ فلاں فلاں مشینری جو مشینوں کے نصب کرانے اور چلانے کے لیے درکار تھی امپورٹ ہونے سے رہ گئی۔ ضرور تائیدِ غیب شریکِ حال رہی ہوگی ورنہ پہلے ہی سال میں مل نفع بخش کیسے ہو جاتی یہاں کے سوت کی ہر جگہ مانگ اور قدر کیوں ہوتی۔ ملز میں طرح طرح کے ہنگامے رہے مگر میں اپنے فرائض سے عزت کے ساتھ فارغ ہوا اور بعد میں بھی یاد کیا جاتا رہا۔ بوریوالہ سے کراچی گیا۔ وہاں سے برانچز کنٹرول کیں اور پنجاب کی کشش دوبارہ مجھے وہاں لے آئی اور ملتان کا چارج ملا۔

ویسے تو میرے سب ہی دوست کرم فرما رہے۔ اور میری کوتاہی تھی کہ دستِ طلب دراز نہ کیا۔ مگر ۴۷ء سے لے کر اب تک ایک دوست ایسا رہا کہ اس نے دستِ طلب پھیلنے کا انتظار نہ کیا اور جن چیزوں کا مانگنا تو درکنار کبھی خیال بھی نہ آیا تھا وہ اس سے ملتی رہیں۔ اس کے یہ یک طرفہ حسنِ سلوک کا سلسلہ جاری ہے جس کی نہ کوئی حد ہے اور نہ انتہا اور نہ جس کا کوئی بدل۔ بدل ممکن نہیں۔ بدل اس کو گوارا بھی نہیں۔

۶۱ء میں آغا صاحب مجھے یو۔بی۔ایل میں لے آئے اور بڑی اہم ذمہ داریاں سونپتے رہے۔ حتیٰ کہ مجھے جائنٹ پریزیڈنٹ کے عہدے تک پہنچا دیا۔ یو۔بی۔ایل میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی خدمت کا وسیع پیمانے پر موقع ملا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایوب خان کے زمانے میں صنعت و حرفت سبک رفتار تھی اور ترقی کی نئی راہیں سامنے آ رہی تھیں۔ خیال تھا کہ شاید وطنِ عزیز مارشل لا کے باوجود بہتری کی راہ پر گامزن ہو جائے۔ اور اس امید میں بڑے کام کرنے کا حوصلہ ہوتا تھا۔ خیر۔

دسمبر ۷۵ء میں دل کا شدید دورہ پڑا۔ آغا صاحب علاج کے لیے لندن لے آئے۔ اچھا ہوا کہ میں بی سی سی آئی کا ہو رہا۔ ادارے کے گوناگوں اور روز افزوں معاملات کا ذمہ دار بنایا گیا۔ بعض کام ایسے میسر ہوئے جن کو ہم خرما و ہم ثواب کہا جائے تو صحیح ہے۔ کیوں کہ ساری توجہ ہمہ وقت سلوک و ہمدردی، محبت خدمت اور مدد اور انسان دوستی پر ہے۔ شاید اس سے

عاقبت سدھر جائے۔

گوالیار میں ایک بہت ذی فہم دانش مند عالم و علم دوست سینیٹر منسٹر تھے نواب سیّد حکیم احمد صاحب۔ ان کی چھوٹی لڑکی سے میری شادی ہوئی۔ بیوی سچ مچ شریکِ حیات نکلی۔ میری ذاتی پریشانیوں میں بڑا ساتھ دیا۔ بہت ہاتھ بٹایا بلکہ ان کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ خدا نے چار لڑکے اور ایک لڑکی عطا کی۔ بچّے سعادت مند نکلے۔ ان کی ذات سے مجھے ہمیشہ مسرّت و راحت ملی۔ خدا کا شکر ہے۔

آنکھیں کھولیں تو چاروں طرف کتابیں دیکھیں۔ باتیں سنیں تو کتابوں کی سنیں۔ شہر سے باہر ایک کوٹھی میں رہتے تھے۔ اس لیے کھیل کود کے لیے ساتھی میسّر نہ تھے اس لیے مشغلہ اختیار کیا تو کتابیں دیکھنے اور پڑھنے کا۔ طلب ہوئی تو کتابیں اکٹھی کرنے کی مگر افسوس کہ نعمتِ علم سے بے بہرہ رہا۔

طالبِ علمی کے زمانے میں لکھنے کا شوق رہا۔ افسانوں پر طبع آزمائی کی، تنقیدی مضامین لکھے۔ نثری نظموں کا ترجمہ کیا۔ کچھ چیزیں چھپی ہیں۔ باقی طاقِ نسیاں پر رکھی گئیں اور ایّامِ رفتہ کے حوالے ہوئیں۔ پاکستان آیا تو یہ شوق مصروفیت اور تساہل کی نذر ہو گیا۔ جن مصروفیات نے یہ قیمت مانگی ان کا بھی کیا حاصل ہے۔ اب، جب عمر ساٹھ سال سے بھی تجاوز کر چکی ہے، غالبؔ کا یہ شعر سمجھ میں آیا ہے ؎

بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمر خضر حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

تاہم اب بھی دل میں یہ لگن باقی ہے کہ کوئی کام تو ایسا ہو جائے جو زندگی پر بے صرفہ کی تہمت نہ ہے۔

اس جستجو میں اس آرزو میں ع اک عمر ہے اپنی ہر ساعت امروز ہے اپنا ہر فردا

مضامین

قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی

(تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ)

زیرِ طبع

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ، کراچی ۱

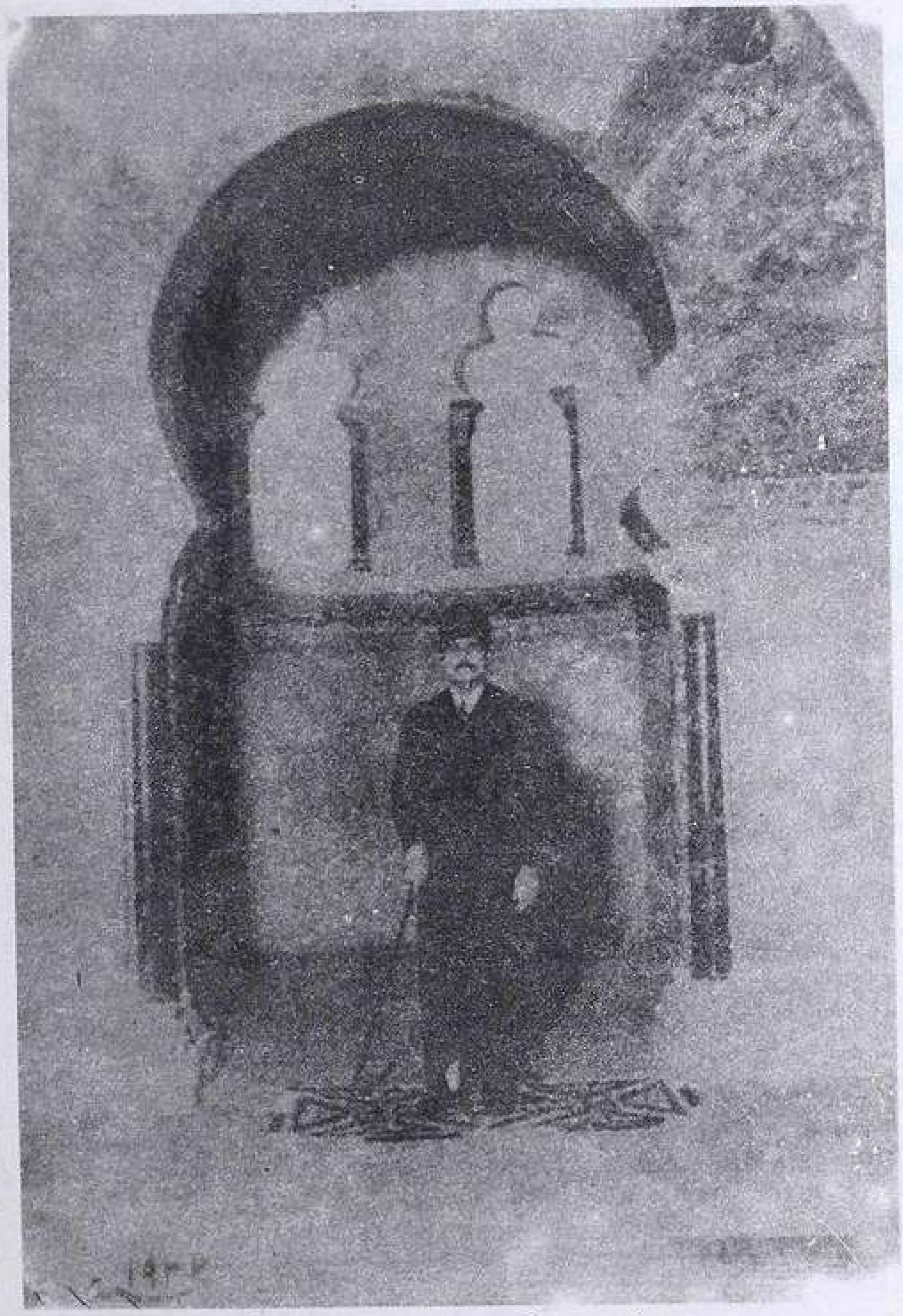

دل بکسے نباختہ ، بادو جہاں نساختہ
من بحضور تو رسم . روزِ شمار ایں چنیں

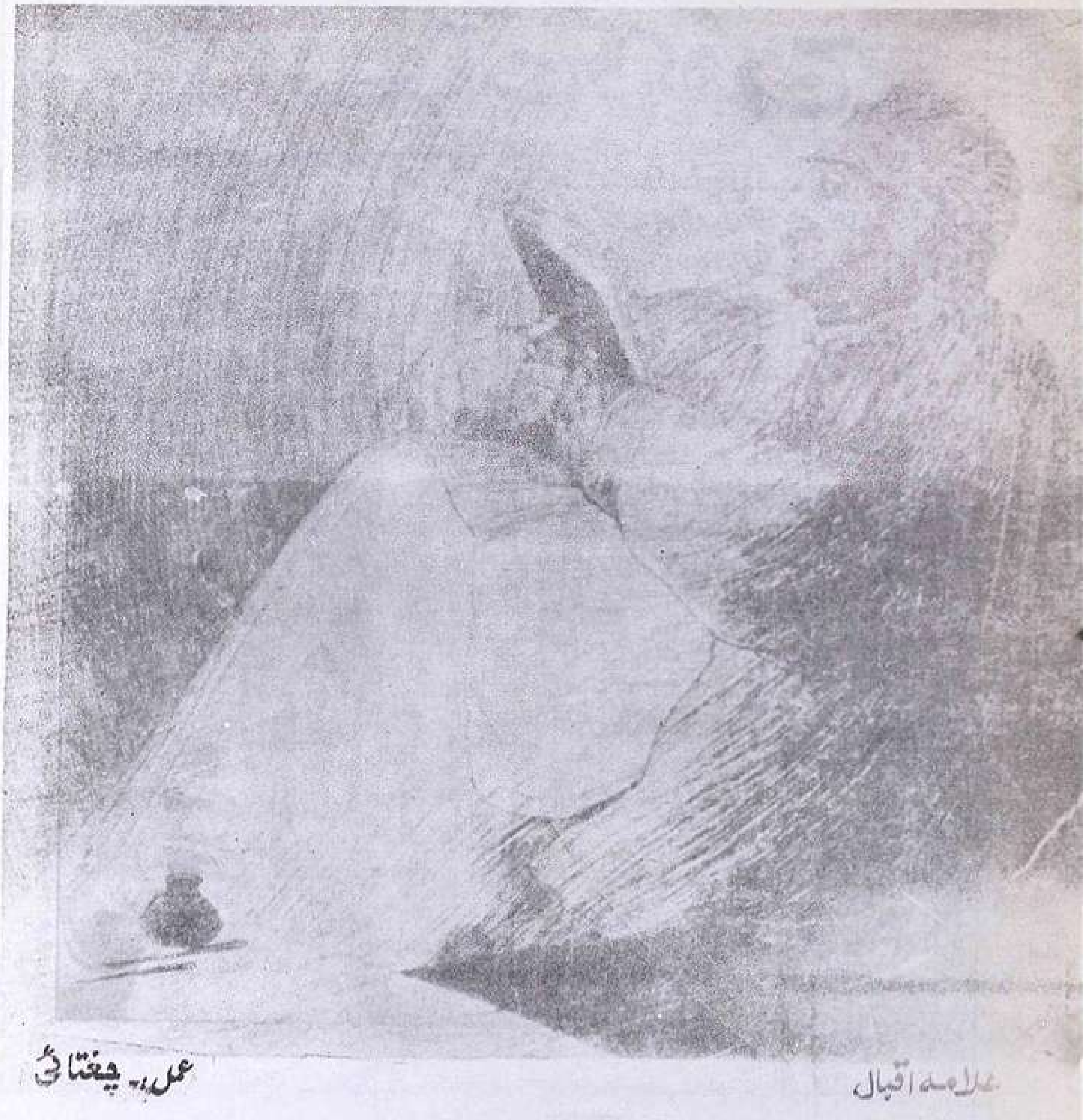

عمل، چغتائی

علامہ اقبال

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

ڈاکٹر صابر حسین جلیسری

فکرِ اقبال کا ایک اہم پہلو

انسانی زندگی میں جہد و عمل کی اہمیت

کلامِ اقبال کا ایک اہم موضوع اور تعلیماتِ اقبال کے اہم نکات میں سے ایک اہم نکتہ جہد و عمل کی تلقین ہے۔ اقبال قوموں کے عروج و زوال میں جہد و عمل کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ بالخصوص مسلمانوں کی تہذیبی و تمدنی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے اسے مسلمان قوم کی موت و حیات کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ وہ انسانی زندگی میں جہد و عمل کی اہمیت قرآنی تعلیمات کی روشنی میں بیان کرتے ہیں اور فطری تقاضوں کے پس منظر میں اس کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہیں۔

اقبال کا دور غلامی کا دور تھا اور غلامی کے بھرپور اثرات انھیں برصغیر کے مسلمانوں کی زبوں حالی میں نظر آ رہے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ قوم کو بھی غلامی کی اثر پذیر محرکات کا ادراک ہو اور وہ ان سے نجات کے حصول کی کوششیں کرے۔ انھوں نے قوم کو یہ باور کرایا کہ وہ قوم جو عروج کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گئی تھی ذلت و خواری کے غار میں کس طرح گر گئی۔ ان کی نظر میں اس کا ایک یہی سبب تھا کہ قوم کی بے عملی جس نے اسے غیر اقوام کے حلقۂ غلامی میں دے دیا۔ وہ اپنے کلام کے ذریعے اپنی قوم کی قوتِ عمل کو اُبھارتے ہیں اور جانتے ہیں کہ جہد و عمل کا جذبہ اس قوم کو قعرِ مذلت سے نکال کر بامِ عروج پر پہنچا سکتا ہے اس لیے وہ برِّصغیر کے مسلمانوں کو جہد و عمل کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان مجاہدانہ شان سے زندگی بسر کریں۔ سرخ رو اور سربلند ہو کر جئیں یا مقصدِ حیات کے حصول میں اپنی جان قربان کر دیں۔ اس سلسلے میں وہ قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "قرآنِ پاک کا رجحان زیادہ تر اس طرف ہے کہ فکر کی بجائے عمل پر زور دیا جائے۔"[1]

دوسرا اہم نکتہ یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ انسان علمِ الٰہی کا وارث ہونے کے سبب غیر معمولی دماغی قوتوں، اعلیٰ صلاحیتوں اور دقیق شعور کا حامل ہے۔ اس کی صلاحیتیں اور شعوری قوتیں ان تمام نعمتوں سے استفادے کا شرف حاصل کرتی ہیں جو قدرت نے انسان کی قوتِ ادراک کو آزمانے، اس کی تخلیق کے شعور سے اس کی آگاہی کے معیار کو پرکھنے کے لیے اس کائنات میں پوشیدہ رکھی ہیں۔ ان نعمتوں کے انکشافات اور ان کے یافت کو روحانی دنیا رحمتِ خداوندی اور برکاتِ آسمانی کا نام دیتی ہے۔ لیکن

---

[1] دیباچہ "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ"

قرآن واضح کرتا ہے کہ سعیِ انسانی اپنے معیارِ عمل کے مطابق ہی یافت کی توقع کر سکتی ہے۔ اقبال سعیِ انسانی کے اس معیار پر زور دیتے ہیں تاکہ وہ ان نعمتوں سے سرفراز ہو سکے جو دنیا میں اسے درجۂ امتیاز عطا کرتی ہیں۔ وہ اس شعور کو اُبھارنے کی کوشش کرتے ہیں جو مسلمانوں کی خوابیدہ صلاحیتوں کو مہمیز کر سکے اور وہ اپنی منزل کی طرف گامزن ہو سکیں ؎

یہ تلاشِ متصل شمعِ جہاں افروز ہے　　تو سنِ ادراک انساں کو خرام آموز ہے

ادراک کا ذریعہ قرآنِ کریم ہے۔ اقبال نے نئی نسل کو اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ قرآنِ کریم فلسفے اور الٰہیات کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ اس کا مقصد دل کو اطمینان عطا کرنا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ قرآنِ کریم کو اس زاویۂ نگاہ سے پڑھو کہ اللہ تعالیٰ سے ہمارا کیا رشتہ ہے اور کائنات میں ہمارا کیا مقام ہے۔ قرآن اس لیے نازل ہوا ہے کہ وہ انسان میں خدا سے ربطِ قلبی کا اعلیٰ شعور پیدا کر دے تاکہ انسان اس ربط کی بدولت مشیتِ ایزدی سے ہم آہنگی پیدا کر سکے[1]

اقبال انسان میں ربطِ قلبی کا اعلیٰ شعور اس لیے پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ اس ربط اور شعور کے بغیر انسان اپنی تخلیق کے مقاصد پورے نہیں کر سکتا۔ فطرت کے تقاضے کیا ہیں جن کا ادراک اقبال کرانا چاہتے ہیں؟ اس سلسلے میں وہ کہتے ہیں کہ انسان قرآن سے رجوع کرے۔ وہ "پیامِ مشرق" کے دیباچہ میں رقم طراز ہیں:

> "مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوامِ شرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے خوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنے فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدِنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔"

جہد و عمل کے باب میں فکرِ اقبال کی اساسی جہت کو سمجھنے کے لیے ان کی تحریر کا منقولہ بالا اقتباس بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ قرآنِ حکیم کی روشنی ہی میں حیاتِ انسانی کی قدریں معیّن کرتے ہیں ؎

نسخۂ تکوینِ اسرارِ حیات　　بے ثبات از قوتش گیر و ثبات

اقبال انسان کی ذات میں جو انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں وہ جہد و عمل کی کوششوں کو فروغ دے کر حاصل ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ انسانی زندگی میں قوتِ عمل کو اہمیت دیتے ہیں اور اسے زندگی کی علامت گردانتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی ایک ایسی قوت سے عبارت ہے جو کائنات کی ہر شے کو متحرک رکھتی ہے۔ یہ تحریک مقصدِ حیات کے حصول کو واضح کرتی ہے۔ انسان اس کائنات کا جزو لاینفک اور اس کا سب سے زیادہ فعال عنصر ہے۔ لہٰذا نظامِ کائنات کی صحت میں اس کی وہی اہمیت ہے جو

---

[1] روزگارِ فقیر (۱۹۶۶ء) ص: ۲۳

مشینری کے کل پرزوں کو متحرک رکھنے کے لیے انجن کی ہوتی ہے۔ اس کی سرگرمیاں نظامِ کائنات کی ترتیب و تنظیم میں تغیّر و تبدل اور ان کے استحکام و افادیت کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ لہٰذا اس کارگہِ ہستی میں اس کے عمل کی بڑی اہمیت ہے۔ اقبال چاہتے ہیں کہ انسان اس اہمیت کا ادراک کرے اور اسے مقصد بنائے۔ بے مقصد عمل صلاحیتوں اور فعال قوتوں کو ضایع کر دیتا ہے۔ لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ اپنی عملی قوتوں کو بروئے کار لاکر فطری تقاضوں کی تکمیل کرے، اپنی روح کی گہرائیوں میں انقلاب برپا کرے اور وہ نورِ بصیرت حاصل کرے جو ان کی فہم و فراست نے حاصل کیا ہے۔ اقبال اس باب میں جب قرآنِ حکیم سے استفادے کی تلقین کرتے ہیں تو اس سے انسان میں روحانی قوتوں کا ترفع مراد ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تخلیقی قوتوں کے ساتھ ساتھ روحانی قوتوں پر بھی نظر رکھی جائے کیوں کہ روحانی قوتوں کے بغیر تخلیقی قوتیں حیاتِ انسانی کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل نہیں کر سکتیں اس لیے وہ تخلیقی قوتوں کے ساتھ روحانی قوتوں کو بروئے کار لانے پر زور دیتے ہیں۔ ان کے کلام کا معتدبہ حصّہ اسی فکر کی تبلیغ کا پرتو ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ روحانی قوتیں انسانیت کی تکمیل کرتی ہیں۔ ان سے اخلاقیات کا ترفع ہوتا ہے، تخلیقی صلاحیتیں عروج حاصل کرتی ہیں اور ان کی افادیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ نیز ہر دو قوتوں کے امتزاج سے مقاصدِ حیات کے حصول کا جذبہ شدید ہوتا ہے۔ اور اس سے وہ زندگی حاصل ہوتی ہے جو پیمانۂ امروز و فردا سے نہیں بلکہ کارناموں سے ناپی جاتی ہے اور جریدۂ عالم پر اپنے دائمی اثرات ثبت کر جاتی ہے اور ایسے کارنامے ہر دم رواں دواں زندگی ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی قوم ان اوصاف سے عاری ہے چناں چہ انھوں نے اپنے کلام میں قوم کی بے علمی اور بے عملی پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ اس کے ضعف و مکروہات کی تصویر پیش کی ہے اور اسے یہ باور کرایا ہے کہ عمل فطرتِ حیات اور قانونِ قدرت ہے۔ بے عمل قومیں زیادہ عرصے تک اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتیں۔ جب کسی قوم پر بے عملی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور فکر و شعور کے سوتے سوکھ جائیں تو قلب مُردہ ہو جاتے ہیں۔ قلب کی مُردنی جذبات کو فنا کر دیتی ہے اور قوتِ احساس کو مٹا ڈالتی ہے تب نہ ماضی کے مٹنے کا غم رہ جاتا ہے اور نہ مستقبل کے سنوارنے کی اُمنگ۔ اقبال اپنی قوم کو بے حسی اور اس سے پیدا ہونے والی قباحتوں سے نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنی اصلیت سے آگاہ ہوں، اسلام کی برکتوں اور ان صفات سے بہرہ مند ہوں جو اسلام انھیں ودیعت کرتا ہے۔ وہ قومِ رسولِ ہاشمی کی صفات کو سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ مسلمان قوم کی زندگی آفاقی اصولوں کے تابع ہے۔ ان اصولوں سے روگردانی کر کے نہ تو مسلمان فلاح پا سکتا ہے نہ وہ زمانے میں ممتاز ہو سکتا ہے۔ وہ ان اصولوں کی ابدیت اور روحانیت سے مسلمانوں کو روشناس کرانا چاہتے ہیں اور خود بھی جانتے ہیں کہ ان کی معراج کیا ہے انھیں ان اصولوں سے روگردانی کا بڑا قلق تھا اس کا اظہار وہ بڑی دردمندی سے کرتے ہیں۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا　　　کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

زندگی مادی حیثیت میں جزوِ کائنات ہے اور روحانی حیثیت سے خدا کی ذات کا پرتو یعنی انسانی زندگی مادی و روحانی امتزاج ہی سے عبارت ہے اقبال اسی زندگی کے قائل ہیں اور وہ انہی صفات کی روشنی میں زندگی کے تقاضوں کی تکمیل چاہتے ہیں۔ زندگی میں یہ امتزاج اقتضائے فطرت کے عین مطابق ہے۔ کائنات کی دیگر حقیقتوں کی طرح وہ زندگی کے ٹھوس حقائق پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے زندگی کے ٹھوس حقائق بیان کیے ہیں اور اس امر پر

زور دیا ہے کہ انسان ایک نصب العین کے تحت زندگی گزارے۔ نصب العین عملی قوتوں کو فعال اور شعور کو بیدار رکھتا ہے۔ بے مقصد زندگی جمود کا شکار ہو جاتی ہے جسے موت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

زندگانی را بقا از مدعا است
کاروانش را درا از مدعا است

اقبال چاہتے ہیں کہ انسان اپنی مخفی صلاحیتوں کا ادراک کرے اور انھیں بروئے کار لانے کے لیے عملی اقدام کرے۔ کائنات میں پھیلے ہوئے فطری عناصر پر غلبہ حاصل کرے اور مخلوقِ خدا کو ان سے مستفید کرنے کے لیے اپنے عمل سے ان کی ہیئت میں تغیّر برپا کر دے۔ ان کی افادیت کو اُجاگر کرے اور ہمہ وقت اس مقصد کی تکمیل میں سرگرداں رہے۔ زندگی ہمہ وقت رواں دواں رہنے کا نام ہے۔ بے عمل انسان اور بے عمل قوم کی موت و حیات برابر ہیں۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ بھرپور زندگی گزارے، ہمت و استقلال کا مظاہرہ کرے، حوادث کا بلند ہمتی اور اعلیٰ حوصلگی سے مقابلہ کرے اور اپنی قوتِ عمل سے کائنات کی تقدیر بدل دے۔ اختراعات و انکشافات کی راہیں کھول دے، اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس جہان کو جہانِ دیگر کی دلیل بنا دے۔ اقبال نے اپنے کلام میں اس عزم و حوصلہ اور قوتِ عمل کا مظاہرہ کیا ہے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

ان اشعار میں اقبال نے انسان کی غالب صلاحیتوں کو بیان کیا ہے جو بہ حیثیت اشرف المخلوقات اس کو ودیعت ہوئی ہیں۔ اور جن کے ادراک و استخدام کی متعدد مواقع پر تلقین کی گئی ہے۔ انسان مخلوق بھی ہے اور تخلیق کار بھی۔ اس کی ذات میں تخلیقی قوتیں اور صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ وہ جب ان صلاحیتوں اور قوتوں ادراک کرتا ہے تو تخلیق کی راہ میں قدم رکھتا ہے اور عناصر فطرت میں تغیّر و تبدل کے ذریعے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے جن سے ان کے جذبے اور جہد و عمل کا اظہار ہوتا ہے۔ یوں تو کائنات کا ذرہ ذرہ اپنی تخلیق میں اکمل و اعلیٰ ہے۔ تاہم اس کے ترفع و افادیت کے پیشِ نظر اس میں تغیّر و تبدل کی گنجائش رکھی گئی ہے تاکہ انسان اپنے عمل سے اس میں تغیّر و تبدل کر سکے۔ قدرت کی اس حکمت سے انسان کی ذات میں جوشِ عمل و فکر و نظر کی قوتوں کو ترغیب ملتی ہے۔ منقولہ بالا اشعار میں ان ترغیبات کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ ان اشعار میں جوشِ عمل، فکر و نظر، حوصلہ مندی اور نیابت الٰہی کی صفات بیان ہوئی ہیں۔ "از زہر نوشینہ و از سنگ آئینہ سازی" کے عمل کو انسانی حوصلہ اور اس کی صلاحیتوں کی بے مثال، مثال سمجھنا چاہیے۔

اقبال مسلمانوں کے عروج و زوال کے بیان میں جہد و عمل کو خاص اہمیت دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنی زندگی میں عمل کے اسی معیار کو اپنائیں جو ان کے اسلاف کا مطمحِ نظر تھا۔ چناں چہ وہ انھیں تخمین و ظن کے سحر سے نکال کر تحقیق و جستجو کی طرف راغب کرتے ہیں ؎

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن

بندۂ تخمین وظن کم کتابی نہ بن

وہ کہتے ہیں کہ دینی و دنیاوی زندگی میں تمام قیاس آلائیاں باطل ہیں۔ حقیقت کا عرفان، بصیرت افروزی اور اس وجدان سے حاصل ہوتا ہے جو تکذیب وشک اور تذبذب کی تمام کیفیتوں سے نجات بخشتا ہے۔ انسان میں تشکیک و تذبذب کی یہ کیفیات عملی اقدام میں اپنے فلسفیانہ تجسس کے سبب ہمیشہ مانع رہی ہیں۔ حقائق کی تلاش میں جو کہ انسانی حیات کا اہم مقصد ہے۔ روحانیت کے حامل افراد نے مراقبہ اور وہم کے ذریعے اپنے باطن تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ فلسفیوں نے قیاس کو بنائے تحقیق بنایا جو اصل میں گمان ہی ہے لیکن اس کے سقم کو محسوس کر کے انھوں نے منطقی استدلال اختیار کر لیا اور اس کا نام قیاس رکھ دیا۔ سائنس دانوں نے اگرچہ سائنس کے دائرے میں تحقیقات کے لیے علمی طریقہ اختیار کیا ہے مگر مابعد الطبیعیات کی حدود میں وہ بھی عملی طریقہ چھوڑ کر قیاس وگمان اور اندازے اور تخمینے پر عمل پیرا ہو گئے۔ قرآن اس طریقِ تجسس کو غلط قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ انسان کی گمراہی کا اصل سبب یہی ہے کہ وہ تلاش حقیقت کی بنا گمان اور قیاس آرائی پر رکھتا ہے۔ اس کے مقابلے میں قرآن نے فلسفیانہ تحقیق کے لیے صحیح علمی و عقلی طریقہ یہ بتایا ہے کہ قیاس وگمان اور مراقبہ اور استدراج سے قطع نظر کر کے ان آثار پر غور کرو جو کائنات میں بکھرے ہوئے ہیں اور شب و روز انسان کے مشاہدے میں اور تجربہ میں آتے ہیں اور ان کی تحقیق و تفحص میں مصروف ہو جاؤ۔ اور اس کی حقیقت کو پالو۔ یہی طریقہ اسلامی نقطۂ نظر کی اساس ہے جسے چھوڑ کر مسلمان ارسطو اور افلاطون کے نقشِ قدم پر چل کھڑے ہوئے۔ قرآن میں متعدد مقامات پر نہ صرف اس عمل کی تلقین کی گئی ہے بلکہ خود آثار کائنات کو پیش کر کے ان سے نتیجہ نکالنے اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی باقاعدہ تربیت دی گئی ہے تاکہ سوچنے، تلاش کرنے اور عملی اقدام کرنے کا یہ انداز ذہنوں میں راسخ ہو جائے کیوں کہ یہ طرزِ فکر اختیار کر کے ہی انسان راہِ عمل سے گزرتا ہے۔

"اور مسخر کر دیا تمہارے لیے سب کا سب اس میں فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔" (سورۃ الجاثیہ)

اس فرمان میں ذہنی فکری و جسمانی صلاحیتوں کی بیداری پر زور دیا گیا ہے۔ انسان جسمانی صلاحیتوں سے امورِ حیات کی تکمیل کرتا ہے، فکری صلاحیتوں سے حقائق حیات پر غور کرتا اور اس سے متعلق پیچیدہ مسائل کے حل کی کوششیں کرتا ہے و ماغی صلاحیتوں سے علم حاصل کرتا ہے اور نورِ علم سے ظلمتوں کی تاریکیوں کو روشن کرتا ہے۔ یوں اس کی جملہ صلاحیتیں مقصدِ حیات کی تکمیل کرتی ہیں۔ محولہ بالا آیت میں یہی نکتہ سمجھایا گیا ہے کہ جو کچھ زمین اور آسمانوں میں ہے اس کی رسائی میں ہے۔ وہ چاہے تو یہ تمام اسرار منکشف کر کے اپنے دستِ قدرت میں لا سکتا ہے اور انھیں استعمال کر کے قدرت کی عطا کردہ نعمتوں سے مستفید ہو سکتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے کہ ان میں کتنے ہیں جو اس کی عطا کردہ صلاحیتوں کو بہ احسن طریقے سے استعمال کرتے ہیں اور اس کی پیدا کردہ نعمتوں سے متمتع ہوتے ہیں۔ سورۃ کہف میں بیان ہوتا ہے۔ "بے شک ہم نے بنایا ہے جو کچھ زمین میں ہے اس کی رونق تاکہ جانچیں لوگوں کو کہ کون ان میں اچھا کام کرتا ہے۔" اس آیتِ کریمہ سے مترشح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقل و خرد کی نعمتوں سے نوازا کہ انسان کو یونہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ وہ دیکھتا ہے کہ کتنے لوگ ہیں جو اس کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہیں اور کتنے ہیں جو کفرانِ نعمت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں سے صرفِ نظر

کرنا ان سے بے اعتنائی اختیار کر کے کسلان کا شکار ہو جانا ہی کفرانِ نعمت میں شمار ہوتا ہے اور اس کی بخشندہ نعمتوں سے کماحقہٗ استفادہ کرنا اس کے بندوں کو اس سے فائدہ پہنچانا شکرانِ نعمت ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ فعل ہے۔ لہٰذا یہ عمل عین فطرت ہے اور عمل کے اسی فلسفہ کو اقبال قانونِ فطرت کا نام دیتے اور اس کے لیے جدوجہد اور عملِ پیہم کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ جہد و عمل کو بقائے حیات قرار دیتے ہیں اور اس کی شہادت قانونِ فطرت سے فراہم کرتے ہیں۔ وہ فطرت کے جس گوشے پر نظر ڈالتے ہیں اسے حقیقت کا ترجمان پاتے ہیں۔ اور حقیقت کی ترجمانی انھیں عملِ پیہم میں نظر آتی ہے۔ وہ عمل سے خارج زندگی کو موت قرار دیتے ہیں۔ ان کے ذہن میں جس زندگی کا تصور ہے وہ اسے کائنات کے ذرّے ذرّے میں رو بہ عمل پاتے ہیں اور اس راز کو آشکار کرتے ہیں جس کی جلوہ آرائیاں کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ غرض یہ کہ اقبال چاہتے ہیں کہ انسان تخمین و ظن کے سحر سے نکل کر تحقیق و جستجو کی راہ اختیار کرے۔ عقل و شعور کو محض قیاس و گمان کا ذریعہ بنانے کی بجائے اسے عمل و تفحص کا ذریعہ بنائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں حقیقت کی ایسی شمع روشن ہو جائے جو ان کے اندر وجدان کی کیفیت پیدا کر دے جو تکذیب و شک و تذبذب کی تمام کیفیتوں کا خاتمہ کر دے اور تمام قیاس آرائیوں کو باطل قرار دے اور وہ اسلام کے عملی پہلوؤں کو دلیلِ راہ بنائے۔ تحقیق و جستجو کا شعور پیدا کرے اور ان کے اندر اپنی روایات کے پاس کا جذبہ پیدا کرے سیاسی اقدامات سے مستفید ہونے کے ساتھ اس کی افادیت کو عام کرنے کے عملی اقدامات کرے، نیز ظاہری و باطنی علوم کا ادراک کرے اور ان کی روشنی میں جدید دور کے تقاضوں کو سمجھے، ان کی تکمیل کی کوششیں کرے، اس کا ہر عمل افادی پہلو کا حامل ہو جو بنی نوع انسان کو خیر و سلامتی کا احساس فراہم کرے اور اس کا ہر قدم انقلاب آفریں اور تخلیق و ترغیب کا مظہر ہونا چاہیے مگر مسلمانوں کی یہ حالت ہے۔

"افسوس، مسلمان مُردہ ہیں۔ انحطاطِ ملی نے ان کے تمام قویٰ کو شل کر دیا ہے۔ اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا مسحور اپنے قاتل کو اپنا مُربّی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔"[1]

اقبال مسلمانوں کی اس حالت پر اظہارِ افسوس کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ایسی حالت میں زندگی گزارنے والی قومیں زیادہ عرصے تک اپنا قومی تشخص اور اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتیں اور بالآخر ایسے حالات قوموں کی موت پر منتج ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ حالتِ سکر میں پڑے رہنے سے مسلمان کبھی ترقی نہیں کر سکتے اور وہ دنیا میں اس وقت تک سرخرو نہیں ہو سکتے جب تک حقیقت کا ادراک نہ کریں۔ ان کی دُوررس نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ برِصغیر میں تغیّر پذیر حالات مسلمانوں کے قومی تشخص پر دُوررس اور گہرے اثرات مرتّب کریں گے۔ لہٰذا انھیں ان حالات سے مستفید ہونے کے لیے ذہنی و فکری طور پر ابھی سے مستعد ہو جانا چاہیے۔ بصورتِ دیگر غیر اقوام ان پر غلبہ حاصل کر کے واضح طور پر انھیں ان کے اساسی ورثے سے محروم کر دیں گی۔ لہٰذا انھوں نے واضح اور غیر مبہم الفاظ میں مسلمانوں کو تنبیہ کی ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

---

[1] مکتوبِ اقبال بنام شیخ عطاء اللہ، مرتّب مکاتیبِ اقبال ۱/۳۴

ضیاء الرحمٰن صدّیقی

فیض کے نثری افکار

بیسویں صدی کے شعراء میں فیض احمد فیض کا نام بہت ممتاز حیثیت رکھتا ہے ان کی شہرت اور پذیرائی کی بنیادی وجہ نوائی شاعری ہے لیکن نثر میں بھی فیض کے چند مجموعے ملتے ہیں جن کی طرف ہمارے ناقدین اور ارباب نظر نے ابھی تک توجہ نہیں دی۔ البتہ "فیض ایک نثر نگار" کے عنوان سے سحر انصاری کا ایک مضمون نظر سے گذرا جو صرف میزان کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ میزان کے علاوہ فیض کے نثری مجموعوں میں "صلیبیں اپنے دریچے میں"، "مہ و سال آشنائی"، "ہماری قومی ثقافت"، "متاع لوح و قلم" اور "سفر نامہ کیوبا"، شامل ہیں فیض نے چند تنقیدی مضامین اور دیباچے بھی لکھے ہیں۔ جن میں "دست صبا"، "نقش فریادی"، "دست تہہ سنگ" اور کلام فیض کے دیباچے قابلِ ذکر ہیں "میزان" فیض کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو اکتیس مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین میں بہت سی باتیں شاید آج لائق اعتنا نہ ٹھہریں لیکن اس زمانے اور ماحول کے اعتبار سے ناگزیر تھیں۔ میزان کے مشتملات تنقیدی اعتبار سے وقیع نہ سہی لیکن فنی اقدار کے اعتبار سے لائق افتخار ضرور ہیں۔ ان میں ترقی پسندی کا وہ شعور موجود ہے جس سے انسان اور لازمۂ انسانیت کی توثیق ہوتی ہے۔ ان مضامین میں، ایک فنکار کا وہ وژن ہے جس نے زندگی کے کچھ خوابوں کی معنیاتی برت دی ہے۔ میزان اس زمانے کی تخلیق ہے جب پائے وطن میں غلامی کی زنجیریں تھیں۔ زبان و قلم پر پابندیوں کے قفل تھے۔ ادب اس کی تہذیب اور عام معاشرے پر جاگیردارانہ نظام کی چھاپ تھی۔ نظام زریں تہذیب اور معاشرے کا سوتا امراء تھے اور یہاں بھی امراء اس ادب کی پرورش کر رہے تھے جو زندگی کے تقاضوں سے محروم اور موت کی مانگ سے قریب تر تھا۔ ترقی پسند دانشوروں کے قلم جن خوابوں کی تعمیر میں مصروف تھے اس کی تعبیر آزادی کی شکل میں ابھی دور تھی شعر و ادب کی زندگی کی اعلیٰ قدروں اور حصول آزادی کے لیے ان راہوں پر چلنا تھا جو منزل کی نشاندہی کر سکیں۔ اس مجموعے میں وہ مضامین بھی شامل ہیں جنھوں نے فیض کو منزل نما کی حیثیت دی انکی افادیت اس لئے بھی کم نہیں کہ اس کے ذریعہ ہمیں اس تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے جس کی ارتقائی شکلیں ترقی پسند ادب کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔

فیض نے میزان کے دیباچے میں چند سطریں لکھ کر ان مضامین کی نوعیت واضح کر دی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان میں ادبی مسائل پر سیر حاصل بحث نہیں ہے اور اس میں سخن علماء سے نہیں بلکہ عام لکھنے پڑھنے والوں سے ہے جو ادب کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ فیض کے ان مضامین میں رسمی اور روایتی تنقید کا انداز نہیں ملتا۔ اس حقیقت کے باوجود ان میں سے بیشتر مضامین اب سے بیس پچیس برس پہلے لکھے تھے۔ اس لئے وقیع اور اہم ہیں کہ بنیادی طور پر فیض کو ان تنقیدی عقائد سے اتفاق رہا۔ دراصل یہ مضامین

ایک ذمہ دار اور سنجیدہ شاعر کے ذہن کی پیداوار ہیں جن میں ادب معاشرے اور زندگی کے بہت سے مسائل اُبھرتے ہیں جس کا منصب شعر گوئی اور شعر فہمی کے علاوہ زندگی کے بعض اہم سماجی اور فلسفیانہ مسائل پر غور و فکر کرنا بھی ہے۔

فیض کامیاب نثر نگار کی طرح کسی بھی موضوع پر قلم اُٹھانے سے پہلے اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر غور و خوض کر لیتے ہیں مثلاً علامہ اقبال کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اقبال نے موجودہ زمانے کے بنیادی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی مسائل کی تشریح کی ہے اس کوشش میں اور بھی کئی شریک ہیں۔ عام طور پر انکی شاعری تدبر اور فکر کا نتیجہ نہیں تتبع یا غم و غصہ کی پیداوار ہے اور شعراء بھی معاشرتی اور سیاسی مسائل پر گفتگو فرماتے ہیں لیکن ان پر مسائل نہیں ہیں اور ان کی شاعری اکثر اوقات طعن و تشنیع یا فخر و تعلی سے آگے نہیں بڑھتی۔"

فیض کے نثری مجموعوں میں "صلیبیں مرے دریچے میں" فیض کے ۱۳۵ خطوط کا اردو ترجمہ ہے جو انہوں نے زمانہ اسیری میں اپنی بیگم ایلس کو لکھے تھے۔ مہ و سال آشنائی — سویت یونین کے تاثرات ہیں جو فیض کی یادوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ چھٹا باب منظومات اور تراجم کا ہے۔

ہماری قومی ثقافت — فیض کی تقریروں کا مجموعہ ہے جن میں چند ریڈیائی تقریریں بھی شامل ہیں۔ ان میں خصوصاً پاکستانی ثقافت پر سیر حاصل بحث ملتی ہے۔

جہاں تک فیض کی نثر کا تعلق ہے ان کی نثر میں بڑی سنجیدگی اور دھیما پن پایا جاتا ہے اور اپنی بات کو بڑی عمدگی سے بلا تکلف عام لفظوں اور فقروں میں شروع کر دیتے ہیں۔ اختصار کے باوجود ان کی تحریروں میں موضوعات کا بڑا تنوع ہے۔ فطرت کی تصویر کشی کا ایک نمونہ دیکھئے۔

"اس وقت چھاچھم پانی برس رہا تھا آج صبح کی بڑی نظارہ پرور صبح تھی بہت سویرے کالے نیلے، سرمئی، بادل گھر آئے اور چاروں اور آسمان پر چھا گئے پھر ہمارے سر پر بہت سے طاقاتیوں کا تانتا بندھ گیا۔ ننھی ننھی طرح کی خوبصورت چڑیاں تھیں، کچھ سنہری سبز رنگ کی جس کی دم سے ایک مہین لمبا پر نکلا ہوا تھا اور آنکھوں کے نیچے کاجل کی سی لمبی سیاہ لکیر عجیب شوخی و طراری کا پتہ دیتی تھی۔ پھر طوطوں کا ایک غول آیا اور شور مچاتے ہوئے گذر گیا۔ دھیرے دھیرے ٹھنڈی ہوا چلنے لگی اور سب پیڑ پودے منتظر اور آرزو مند نظر آنے لگے۔ پھر بارش ہوئی، یوندا باندی کی صورت میں اور پھر موسلا دھار۔" (خطوط کا مجموعہ)

فیض کے خطوط بڑے دلچسپ اور فکر انگیز ہیں۔ فیض فطرت انسانی کی باریکیوں کو بڑے سہل انداز میں قلم بند کرتے ہیں۔

"ایک خاص عمر کے بعد انسان بنیادی طور پر اپنے آپ کو بدل نہیں سکتا اور اپنی اصلاح کے بارے میں زیادہ خوش فہمی فضول ہے لیکن یہ بھی ہے کہ جب تک چند کڑی آزمائشوں سے گذر نہ پڑے اپنی ذات کے جھوٹ سچ کا پتہ ہی نہیں چلتا، نہ اپنی اصل شخصیت اور اس شخصیت کے درمیان فرق واضح ہوتا ہے جو دکھاوے کے لئے آدمی دنیا کے سامنے کرتا ہے۔"

فیض صحافی کی حیثیت سے بھی مختلف ادبی رسائل اور اخبارات میں خدمات انجام دیتے رہے۔ ۳۹-۱۹۳۸ء میں ماہنامہ "ادب لطیف" کے مدیر رہے۔ ۵۵-۱۹۴۷ء تک ہفت روزہ "لیل و نہار" میں بحیثیت مدیر اعلیٰ کے خدمات انجام دیں۔ فیض پاکستان ٹائمز (PAKISTAN TIMES) کے بھی ایڈیٹر رہے۔ بیروت میں افرو ایشیائی ایڈیٹرز کانفرنس کے جریدے "لوٹس" (LOTUS) کے بھی کافی عرصے

تک مدیر یا علمی رہے۔

فیض نے ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے جو وقتاً فوقتاً نشر ہوتے رہے۔ اور عوام میں بھی پسند کئے گئے۔ پرائیویٹ سکریٹری، سانپ کی چھتری، "تماشا میرے آگے"، فیض کے کامیاب ڈرامے ہیں۔ فیض کی تحریریں موثر اور روش عام سے ہٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ سیدھے سادے براہ راست الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مضمون خواہ کسی بھی موضوع پر ہو، فیض اس کا آغاز کسی غیر ضروری تمہید کے بغیر ایک ایسے جملے سے کرتے ہیں جس کے بعد نفس مضمون شروع ہی سے آپ کے خیال کا دامن تھام لیتا ہے۔ اور ہمہ تن توجہ بن کر اس صحبت میں شریک ہوجاتے ہیں۔ وہ عام زندگی میں بہت کم سخن شرمیلے اور دھیمے لہجہ میں ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرنے کے عادی ہیں۔ شاعری کی طرح ان کی نثر میں بھی ایک طرح کا دھیماپن پایا جاتا ہے۔

فیض کی نثر اکثر و بیشتر سادہ، شگفتہ، دقیع اور برمحل ظرافت سے معمور ہوتی ہے۔ تحریر میں طنز و ظرافت کی آمیزش سنجیدہ اور باوقار ہوتی ہے جس کو پڑھ کر تبسم کی ایک لکیر ابھر آتی ہے۔ نثر نگار کی حیثیت سے فیض نے الفاظ کی ترتیب اور انتخاب میں بیشتر اوقات ذمہ داری سے کام لیا ہے اور خیال کو صحیح الفاظ میں پیش کرنے کے لئے کلچر بانفنڈ، اہمیت اور نااہمیت، تجربات کا تجربہ، جذباتی وفاداری اور اسی قسم کی بہت سی تراکیب وضع کی ہیں جو فیض یا کسی بھی قابل تقلید شاعر یا ادیب کے لئے مناسب نہیں ہے۔

فیض کی نثر نگاری کا اردو میں فی الحال تنقیداعتبار سے کوئی تعین نہیں کیا گیا ہے۔ تاہم ان کی نثر آج کے دور کی نثر کہی جاسکتی ہے۔ فیض کو بین الاقوامی لینن ایوارڈ سے بھی نوازہ گیا۔ لیکن ان کی شہرت کی ابتدا مرے کالج سیالکوٹ کی ایک ادبی تنظیم" اخوان الصفا"، کے ایک طرحی مشاعرے میں پہلی غزل پڑھنے سے ہوئی۔ فیض کی ہر تخلیق چاہے وہ شعر ہو یا نثر یا نجی مکتوب کی صورت میں ادب کا بیش بہا سرمایہ ہے۔

فیض کی تاریخ ولادت میں بعض لوگوں کو اختلاف ہے۔ لیکن ان کے ایک خط سے ثابت ہوتا ہے کہ فیض کی پیدائش ۱۲ ر فروری ۱۹۱۱ء کو سیالکوٹ میں ہوئی اور ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو داغ مفارقت دے گئے

بابائے اردو یادگاری خطبہ

جدید اردو تنقید

ڈاکٹر وزیر آغا

(زیر طبع)

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ، کراچی ۱

آصف فرخی

بیدی کی ایک کہانی

بیان کیا جاتا ہے کہ منٹو نے ایک دفعہ بیدی سے کہا کہ تم افسانہ لکھنے سے پہلے سوچتے ہو، افسانہ لکھنے کے دوران سوچتے ہو اور افسانہ لکھنے کے بعد سوچتے ہو۔ اس کے بعد جواب میں بیدی نے تو خیر منٹو کے زبردست چٹکی لے لی تھی۔ لیکن منٹو کا یہ فقرہ بیدی کے افسانہ نویسی کے طریقۂ کار کا اچھا خلاصہ ہو سکتا ہے۔ البتہ اب اس میں یہ اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ بیدی افسانہ لکھنے کے بعد ہی نہیں، افسانہ چھپ جانے کے بعد بھی سوچتے رہتے تھے۔ افسانہ گھڑنے سے لے کر اسے کاغذ پر اُتارنے تک کا عمل بیدی کے ہاں پیچ در پیچ اور تہہ در تہہ سرانجام پاتا ہے۔ اور کاغذ پر ایک شکل اُتار لینے کے بعد کمی بیشی، کاٹ چھانٹ، کتر بیونت کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ بیدی فطرتِ انسانی کے جتنے باریک بیں محرمِ راز ہیں، فن کے معاملے میں بھی اسی تکمیل پسندی کے قائل ہیں۔ وہ افسانے کی ڈرائنگ میں ذرا سا جھول نہیں پیدا ہونے دیتے، کسی گرینڈ ماسٹر نقاش کی طرح بہت سوچ سمجھ کر رنگوں کا 'سٹروک' لگاتے ہیں۔ ان کا مستعد اور فطین ذہن، کئی بار خود افسانوی ساخت کے اندر بھی آسیب کی طرح حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے یا جو ڈبلیو بی ڈ ییٹز نے کہا تھا کہ ذہن کے عمل کا اس طرح احساس ہوتا ہے جیسے لمبی ٹانگوں والی مکھی پانی کی سطح پر تیر رہی ہو۔ یہی ذہن بار بار کہانیوں کو پرکھتا بھی رہتا ہے، کسوٹی پر رکھ کے دیکھتا ہے۔ اور جہاں جہاں کوئی کور کسر نظر آتی ہے وہاں آرینج تیشہ بھی کر دیتا ہے۔ بیدی کے کئی ایک افسانے ایسے بھی ہیں جو پہلے پہل چھپنے کے بعد جب بالآخر کتاب تک پہنچے تو مصنف کا قلم ایک بار پھر ان پر چل چکا تھا۔ افسانہ "چشمِ بد دور" جو بیدی کے حالیہ افسانوں میں سے غالباً اہم ترین ہے۔ اس کی مختلف مطبوعہ شکلوں میں بھی اس عمل کو کار فرما دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن بعض دفعہ اس چھنٹائی کی زد میں پورا کا پورا افسانہ آ جاتا ہے۔ بیدی نے جہاں اپنے ہاتھوں کو قلم کیا، وہاں بعض اپنے افسانوں کو قلم زد کیا گیا۔ ایک انٹرویو میں بیدی نے اپنے ابتدائی دور کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"اس وقت ہم ہفتہ وار اخباروں میں لکھتے تھے اور وہ چھاپ دیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کچھ افسانے لکھے تھے، جیجا بائی کی بہ نسبت نہ، "گدھی کا سرار" جو پتہ نہیں کہاں ہیں۔ ایک اور افسانہ لکھا تھا "مہارانی کا تحفہ" جسے سال کا بہترین افسانہ قرار دیا گیا تھا "ادبی دنیا" میں لیکن میرا رنگ چونکہ REALISTIC تھا، میں ایسے افسانے لکھنا چاہتا تھا جو روزمرّہ کی زندگی سے مستعار ہوں۔ میں پوسٹ آفس میں معمولی کلرک تھا اور اپنے مشاہدے کی چیزیں قلم بند کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس افسانے

ہیں اتنی ٹیگوریت غالب تھی کہ زبان کے اعتبار سے بالکل ایسا لگتا تھا کہ ٹیگور نے لکھا ہے۔ اسی لیے میں نے جب اپنا پہلا مجموعہ 'دانہ و دام' شائع کیا تو سب کے اصرار کے باوجود، اور اس بات کے باوجود کہ ادبی دنیا، کے ضخیم نمبر میں سال کا بہترین افسانہ اسے قرار دیا گیا تھا۔ میں نے اس کو مجموعے میں جگہ نہیں دی، اس سے ایک اور چیز کا پتہ چلتا ہے کہ انتقاد کی نظر کیا ہوتی ہے 'ادبی دنیا، کا ایڈیٹر جس افسانے کو سال کا بہترین افسانہ سمجھتا ہے میں اسے اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ اپنے مجموعے میں شامل کروں۔"

(بیدی سے ایک ملاقات، یونس اگاسکر 'شاعر' شمارہ ۱-۲ - ۱۹۷۵ء)

یہ بحث تو اب کچھ فرسودہ سی ہو چلی ہے (شاید یہ غالب اور نسخۂ حمیدیہ کے حوالے سے ہم کہ فن کار خود اپنے فن کا ناقد ہو سکتا ہے یا نہیں، اور آیا اپنی تخلیقات کے بارے میں اس کا انتخابی فیصلہ بھی قابل قدر ہوتا ہے، لیکن بیدی صاحب کے ان قلم زد افسانوں کی دوبارہ اشاعت کا مسئلہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ اردو کے افسانوی ادب میں بیدی صاحب اس مرتبے کے مالک ہیں کہ ان کا تمام و کمال تحریری سرمایہ ہمارے سر افسانے کے شجر سبز میں شاخ گل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں اس کی تفہیم و انتقاد ہمارے لئے ایک تخلیقی ضرورت بن جاتی ہے، وہاں اس سرمائے کے منتشر حصوں کی شیرازہ بندی بھی لازم ہے۔ ممکن ہے کہ بیدی کے کچھ افسانے بھی خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے ہوں لیکن جو افسانے ضبطِ تحریر میں آگئے (اگرچہ درج گزٹ، ہونے کے بعد بھی مندرجہ ذیل کہانی کی طرح ناگفتہ ہی رہ گئے) ان کی بازیافت ضروری ہے۔ ایسی کئی چیزیں رسالوں میں اماناً دفن ہیں۔ ایسی ہی ایک تحریر "پہاڑی کوّا" ہے، جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ بیدی کے کسی نامکمل ناول کا ابتدائی حصّہ ہے اور ایک کہانی ہے جس کا نام ناگفتہ، ہے۔ یہ کہانی ساغر نظامی کے مرتب کردہ مجموعے 'چھپو' سے لی گئی ہے جو ساغر نظامی کی زیر ادارت میرٹھ سے شائع ہونے والے رسالے "ایشیا" میں شائع شدہ کہانیوں کا دس سالہ انتخاب (۱۹۳۵ء تا اپریل ۱۹۴۴ء) ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ یہ کہانی بیدی کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ یہ اس کے بعد نہیں چھپی۔ مجموعوں میں شامل ہونے سے سہواً چھوٹ گئی یا عمداً چھوڑ دی گئی۔ یہ مسئلہ تو تحقیق طلب ہے اور اس پر بیدی کا کوئی آئندہ سوانح نگار روشنی ڈالے گا۔ لیکن تب تک ہمارے لئے یہ کہانی پرانی ہوتے ہوئے بھی نئی ہے۔ بیدی اس قدر شاداب و توانا کہانیاں کہتے ہیں کہ ان کی کسی بھی تحریر کو طاق نسیاں پر فراموش گاری کی دھول مٹی کھانے کے لئے نہیں چھوڑا جا سکتا کہ ایسی ہی کہانیوں سے تو شاخ نہال غم ہری رہتی ہے۔ بیدی کے پہلے مجموعے کی پہلی کہانی میں ایک بھولا بھالا بچہ آدھی رات کو گاؤں کی سڑک پر روشنی لے کر بھاگتا ہے کہ اس نے دن کے وقت جو کہانی سنی تھی تو اس وجہ سے مسافر راستہ نہ بھول جائیں۔ بیدی کی کہانیاں اسی اُجالے کی لکیر ہیں۔ دن ہو یا رات، اسی لئے تو ان کو سننے والا مسافر راستہ نہیں بھولتا۔ راستہ یاد رکھتا ہے۔

بیدی کے یہ خود نوشت حالات، اگرچہ ان کی ادبی زندگی کے ابتدائی دور تک محدود ہیں۔ لیکن ان کی غیر مدون اور غیر معروف تحریروں میں شامل ہیں جن کی بازیافت ضروری ہے۔ یہ خود نوشت بشیر ہندی کے مرتب کردہ مجموعے "میرا پسندیدہ افسانہ" کے لئے لکھی گئی تھی۔ اس کتاب پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے، لیکن یہ قرارداد پاکستان سے قبل لاہور سے شائع ہوئی تھی۔

راجندر سنگھ بیدی

ناگفتہ

ڈوگرہ حوالدار نے ٹھونک کو کانوں تک کھینچ لیا، بندوق نیچی کی اور خالی بیادہ کے بٹن کو کاج میں پھنساتے ہوئے بولا۔

"اب تم میں سے کون بولے گا۔ آگے؟"

آدھی درجن کے قریب باڑھ کی سی آوازیں آئیں۔ "ہام" یعنی ہم!

رنگپور گاؤں کے جنوب کی طرف، جہاں بیس ایک کے قریب ٹوٹے ہوئے مچان کھڑے تھے۔ دور تک فارم کی کپاس اپنے سفید سفید دانت نکالے منہ چڑا رہی تھی۔ وہ بھی عام جوان اور بوڑھی عورتوں کی طرح تھی"۔ بھرتی والوں سے سخت نفرت۔ اس کے سبز زرد پتوں پر کہیں کہیں بنولے۔ بڑے بڑے آنسوؤں کی صورت میں ڈھلک رہے تھے۔

رنگپور جرنیلی سڑک پر واقع تھا۔ دور سے مسجد کے مینار اور سکھوں کے گوردواروں کے نشان صاحب، بادلوں کی بھوری سفیدی کے خلاف زرد زرد اور لہراتا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ گویا گاؤں کے ارتقا میں عبادت گاہیں رہائش گاہوں سے پہلے وجود میں آگئی تھیں لیکن جیتھ والے خوش تھے۔ مسلمان مسجد میں سے اور سکھ گوردوارے سے مفت لقمے اڑا کر روزانہ بھتہ بچا سکتے تھے اور پھر ہمیشہ کی طرح آوارہ مرغیاں بھی چرائی جا سکتی تھیں۔ کچھ دور جانے پر رنگ پور کے واگی بھی دکھائی دیئے۔ وہ ڈھوروں کو کھیتوں میں سے ہٹا کر جرنیلی پر پھینکنا چاہتے تھے۔ لیکن ڈھوروں کا ایک چوتھائی بٹلی حصہ میں اڑا ہوا تھا اور اپنی کھال میں مست جگالی کر رہے تھے۔ اس کے منہ سے بڑے بڑے بتاسے پانی میں گر گر کر پھیل رہے تھے۔ ہوہو، تیرے مری مالک، ہوہو... واگی دور سے آواز دیتے۔ پھر تہمد کو اوپر اٹھاتے لیکن کھائی کے ٹھنڈے پانی میں داخل ہونے کی ہمت نہ پڑتی۔ اس پر آج پہاڑ کی طرف سے کٹارے پھل کی طرح تیکھی اور کاٹ دینے والی ہوا چل رہی تھی اور جیتھ کے آدمیوں کو گرم کپڑوں میں لہو کی گراں ترین شراب کا مزا آ رہا تھا۔

سپاہی پردمن سنگھ نے ایک مینڈ پر کھڑے ہو کر پیچھے کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کوئی اتا پتا نہیں بھرتی افسر کا؟"

"وہیں تحصیل میں مچل گیا ہوگا، بہن کا... حوالدار بولا۔

جیا تے نے خرگیں میں سے ایک پھولا ہوا، دیسی سنگترہ نکالا اور اس کا چھلکا ہوا میں اچھالتے ہوئے بولا۔

ڈھول بھی نہیں ہے آج۔ وگرنہ بھرتی افسر کی کار، اور پتہ نہ چلے؟"

ایک عجیب انداز سے ککیاتے، ہمیاتے، گلکاریاں مارتے جتھو والے رنگ پور کی طرف بڑھے۔ رنگ پور کا نمبردار لچھو بھی ساتھ ہی تھا۔ ضلع سے براہ راست اس کے نام پروانہ آیا تھا۔ ایک سو چار آدمی اس نے پچھلی جنگ میں دیئے تھے۔ جن کی جاں بازی اور شہادت کا پتھر کسی شہر کے عجائب گھر میں پڑا تھا۔ تیس پینتیس کے قریب اس لڑائی میں جا چکے تھے اور بہت سے نوجوان ابھی گاؤں ہی میں دکھائی دے رہے تھے۔ لچھو سب کے حالات سے واقف تھا۔ مثلاً یہ کہ ماڑی والوں سے لفٹی کے لیے دو پڑھے لکھے، پلے ہوئے جوانوں کی توقع تھی۔ اس کے علاوہ لچھو اور بہت سے کام کرتا تھا۔ مثلاً اس نے بٹیر پال رکھے تھے۔ جب وہ ان بیٹروں کو جنگ کے لئے آمادہ کرنا چاہتا تو انہیں کئی کئی دن بھوکا رکھتا۔ ان کی گنگنی بند کر دیتا اور خشمگیں ہو کر ہر اپنے اور پرائے سے لڑنے کے لیے تیار ہو جائے۔

مدرسے کے قریب پہنچتے ہی حوالدار نے سپاہی پرومن سنگھ کو سرس کی ایک بڑی سی چھتری کے نیچے خیمہ گارڈ بنے کا حکم دیا۔ رنگپور کی ٹھٹھی کے باسیوں نے نمبردار کے ہلکے سے اشارے پر جاروب کی بجائے کندھوں پر پڑی موٹی گاڑھے یا گٹی کی چادروں سے ہی زمین صاف کرنی شروع کر دی۔ سبز خون والے سفید سفید کیڑے اور بھکھڑے کے سے چھوٹے چھوٹے کانٹے جو کہ جا بجا بکھرے ہوئے تھے ایک طرف ہٹا دیئے گئے۔ جب سب کچھ ہو چکا تو بینڈ ماسٹر کی چھڑی کی طرح پتلی مگر سخت حوالدار کی لمبی سی انگلی اٹھی اور "ہام" گانے لگے۔

باہر کھڑے رنگروٹ بھرتی ہو جاؤ ئے

... ...

ایتھے تے پاناں ایں ٹٹیاں جتیاں

ایتھے تے پاناں ایں ٹٹیاں جتیاں

جانوروں نے رسّے تڑائے، کوّے اُڑے، کتّے بھونکے اور کچھ دیر بعد رنگپور نے سب کھایا پیا اگل دیا۔ منڈیر پر اور نیچے بچے ہی بچے اور عورتیں ہی عورتیں دکھائی دینے لگیں۔ کچھ عورتیں اپنے ننھوں کو لئے سڑک کے دورویہ جا کھڑی ہوئیں۔ گاؤں کے جاٹ ہاتھوں میں درانتی یا دوسانگے لئے اپنی کھوکھلی بے شغل، غیر مقبوضہ نگاہوں سے حوالدار اور ان کے شامیانے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر ایک مبہم جذبے کے ساتھ ان کا خون حرکت کرنے لگا۔ بھرتی کے خیال نے انہیں متاثر نہیں کیا تھا۔ بلکہ جہاں بھی چار آدمی جمع ہوتے وہیں ان کا لہو جوش مارنے لگتا اور بساکھی کے موسمی بھنگڑے، جھمر یا لڈی انہیں یاد آجاتے۔ اور ایک ہاتھ کانوں پر رکھ کر دوسرا آسمان کی طرف اٹھا۔ او آئی بیساکھی آئی۔ اور گئی بیساکھی گئی۔ کا بے مطلب گانا گا کر اودھم مچانے لگتے۔

جتھ والے بولے ایتھے تے پاناں ایں ٹٹیاں جتیاں

او تھے ملن گے بوٹ بھرتی ہو جاؤ ئے

مجمع میں سے ایک آدمی آگے بڑھا۔ اس کے اندر کوئی فطری سوال زبان پر آنے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ اس نے جھینپی ہوئی نگاہوں سے بندوقوں کی طرف دیکھا۔ پھر اس کا منہ زور سے سُرخ ہوا۔ پھر سرخ سے زرد اور وہ بنا کچھ کہے واپس چلا گیا۔ اس نے چھوٹی خودکشی کر لی.... اور جتھے کے بڑے بڑے وزنی بوٹوں کا سیاہ پالش دمک رہا تھا۔ مولا سنگھ اور جھورا (ظہور دین) ایسے زاویئے پر کھڑے تھے کہ سورج کی شعاعیں پالش کے آئینے میں منعکس ہو کر ان کی آنکھوں میں پہنچ رہی تھیں۔ اگرچہ سورج تھوڑی دیر بعد پھر بادلوں کے پیچھے چھپ جاتا۔ ظہورے نے یونہی اپنے گامے شاہی جوتوں کی طرف دیکھا۔ وہ کبھی کے پرانے ہو چکے تھے اور پھر آج لوہیا کے کھیت میں

سے باہر آئے تھے۔ اور ان پر اب مٹی کا یہ دمک پالش اپنی کند شعاعیں جھورے کے ذہن میں منعکس کرتے ہوئے اسے ایک ناقابل عبور افریقی دلدل بنا رہا تھا۔ ہجوم کے وسط میں کنوئیں کی جگت کے سہارے اچار جن رخو بھی اپنے بچے کو لئے کھڑی تھی۔ اس نے دل ہی دل اپنے اچارج کو وہ سیاہ بوٹ پہنا دیئے۔ اگرچہ وہ اپنی کمر میں ان کی ایک بھی ٹھوکر برداشت نہ کر سکی ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے بوٹوں سے کوئی منکر نہیں تھا اور جتھہ والوں نے جاری رکھا

ایتھے تے پاناں ایں وگدیاں لیراں
اوتھے ملن گے سُوٹ بھرتی ہو جاوئے

× × × × × × × ×

ایتھے تے کھانا ایں گاجر مولی
اوتھے ملن گے فروٹ بھرتی ہو جاوئے

آسمان پر بادل پھٹ گئے تھے اور سورج ہوا کی کٹاری کو کُند کر رہا تھا۔ دیہاتی اپنے نیم برہنہ جسموں کو ڈھانپتے ہوئے جتھہ والوں کے کپڑے اور ان کے خرگینوں میں کھانے پینے کے سامان کی طرف دیکھ رہے تھے اور ایک مبہم سی خواب آلودہ رال کے گھونٹ بھر رہے تھے۔ پہاڑ کی طرف سے دھول کی ایک لہر سی اٹھی اور آناً فاناً میں رنگیو کے آسمان پر چھانے لگی۔ مجمع کے چند آدمیوں نے اوپر کی طرف نگاہ کی لیکن کچھ نہ سمجھتے ہوئے پھر حوالدار کے ٹیونک اور سپاہیوں کی برانڈیوں کی طرف دیکھنے لگے۔ گاؤں کے واحد سفیدا ایک تنھے سے شیشم کے ساتھ سرگوشی کے لئے جھکا۔ سپاہی پردمن سنگھ نے جیاتے سے کہا "بھرتی انسر آ رہا ہے شاید"۔ اور جیاتے نے پردمن سنگھ کی بات کو پوری طرح نہ سنتے ہوئے بھی سر ہلا دیا اور ہٹ کی ہی بھدی آواز میں گانے لگا۔

ایتھے نے ملدا ای داتری رہنا
اوتھے میئی بندوق بھرتی ہو جاوئے

اس سے پہلے شاید دیہاتیوں کو پیٹ اور جسمانی سکھ کا ہی خیال تھا۔ اب بندوق نے ان کے ذہن میں ایک سنجیدگی اور نفرت کی دنیا پیدا کر دی تھی۔ نیتا سنگھ نے اس ششماہی میں چار دفعہ موگے کا منہ بند کر دیا تھا اور مولا سنگھ اسے جان سے مار سکتا تھا۔ جھورا پنی بیوی کے عاشق سے بدلہ لے سکتا تھا۔ بچپن میں کوؤں کے گھونسلے گرانے کے لیے۔ بیر بھوٹیوں کا تیل نکالنے اور مکوڑوں کا اچار ڈالنے کا جذبہ اس عمر میں اپنے ہم جنسوں کو مار ڈالنے کے جنون تک پہنچ گیا تھا۔

کچھ دیر گلا پھاڑنے کے بعد سب ٹھنڈے ہو گئے۔ حوالدار نے لچھو کو کچھ بولنے کا اشارہ کیا۔ اب لچھو بھلا کہاں کا مقرر تھا۔ اس نے اناپ شناپ کہی۔ دراصل اس نے بھرتی گیت کے مفہوم کو دہرایا تھا۔ اور اس بات پر زور دیا تھا کہ وہاں دنیا کی ہر نعمت میسر آتی ہے لیکن لچھو کوئی بہت احمق نہیں تھا جو محض ان باتوں کو دہرا دینے پر اکتفا کرتا۔۔۔ اس نے مدرسہ کا احاطہ کرنے والی بکوہڑ کے قریب کھڑی بڑھیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پوچھو جیونے کی بے بے سے کیا اسے ہر مہینے دس روپے کا منی آرڈر نہیں آتا؟ جیونے کی ماں کے دل میں ایک اُبال سا اٹھا۔ اس نے زور سے کچھ کہنا چاہا لیکن صرف اغ..... اغ..... کہہ کر بلا گلا ملنے لگی۔ اس کے گلے میں بلغم پھنس گیا تھا۔ عورتوں اور مردوں کے ذہن میں روپوں کی سفیدی اور منی آرڈر کی نیلاہٹ خلط ملط ہونے لگی تھی۔ ان کے کانوں میں بھرتی گیت اور

اُغ ... اُغ "گتھم گتھا ہونے لگے۔ آسمان کی آندھی اور زیادہ گہری ہوگئی تھی۔ اس کے بعد کھڑپ کھڑپ، کھڑپ کی سی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے بہت سے پاؤں ایک ساتھ اُٹھ کر زمین پر پڑ رہے ہوں۔ سپاہی جیا تے نے کنوئیں کی جگت پر چڑھ کر مغرب کی طرف دیکھا۔ جرنیلی سڑک پر دور تک کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بھرتی افسر کی موٹر ہوتی کبھی کی رنگپور پہنچ جاتی۔ دور سڑک پر ایک نقطہ سا تھا کہ بسیط ہو رہا تھا۔

ڈوگرہ حوالدار نے رجسٹر کھولا اور ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر اندراج کے لئے بیٹھ گیا۔ لیکن دور سے باجے کی آواز نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ جرنیلی پر پچھم کا نقطہ اچھا خاصا مستطیل ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد سب لوگوں کو سامنے کے چار آدمی دکھائی دیئے۔ ان کے پیچھے کچھ اور تھے۔ پندرہ بیس منٹ میں ایک پلٹن کی پلٹن نظر آنے لگی۔ اور سب لوگ کھڑے ہو کر اس کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

لیفٹ رائٹ لیفٹ ..... لیفٹ رائٹ لیفٹ ..... کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک ہلکی سی دھول رنگپور پر چھا گئی تھی۔ سپاہی گارڈ کی طرف دیکھتے ہوئے جرنیلی پر سے گزرنے لگے۔ اس کے بعد خچر اور چھوٹی چھوٹی گاڑیاں آئیں۔ درمیان میں کہیں ایک بڑا سا اسٹر، ایک بڑے وزنی چھکڑے کو کھینچ رہا تھا۔ ان گاڑیوں اور چھکڑوں میں شاید راشن تھا۔ چھکڑے کے پیچھے دو اڑھائی فرلانگ تک اور سپاہی تھے جن کے پاؤں عین ایک ساتھ اُٹھتے تھے۔ ان کی چھاتیوں پر تمغے اور کندھوں پر نشان تھے۔ کہیں دھات کے بنے ہوئے ستارے اور تاج تھے ......

لیفٹ رائٹ لیفٹ .... فوج چلتی گئی۔ نہ صرف قدم بلکہ سپاہیوں کے بازو بھی ایک ہی ساتھ اُٹھ رہے تھے۔ سورج ڈھلنے پر ہوا اور بھی خنک ہوگئی تھی۔ جوہڑوں کا کف ان کے کناروں پر اکٹھا ہو رہا تھا۔ لیکن انسان کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو کوئی آندھی، جھکڑ یا بگولا روکنے کا اہل نہیں تھا۔ پلٹن کے آدمی کسی دور علاقہ کے دکھائی دیتے تھے۔ ان کا رنگ سیاہ تھا اور قد ٹھگنا۔ دکن میں کہیں بھرتی ہوئے تھے عراق میں دو برس رکھ کر انہیں پنجاب میں تبدیل کیا گیا تھا۔ اور اب انہیں کبھی پشاور، کبھی سیالکوٹ، کبھی لاہور اور جہلم بھیج دیا جاتا ہے اور وہ ہمیشہ کبھی گاڑی میں اور کبھی پیدل کسی نامعلوم جگہ کی طرف پابہ سفر رہتے۔

پلٹن کا آخری حصّہ رنگپور سے گزر رہا تھا۔ آخری چند قطاروں میں سے ایک سپاہی نے اپنے ساتھی کے ساتھ سرگوشی کی اور اپنے جمعدار کی نگاہ سے بچتے ہوئے باہر نکل آیا۔ وہ دبلا پتلا، سکھنڈی سا آدمی تھا۔ اس کے جسم کے کنگرے منہدم ہو رہے تھے۔ اسکی بینائی کمزور تھی۔ چہرے پر موسم کے اثرات شدت سے نمایاں تھے۔ عمر کے لحاظ سے نہ وہ جوان تھا اور نہ بوڑھا۔ قطار سے باہر نکل کر اس نے اپنی چندھی آنکھوں کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپا اور کنوئیں کے منڈیر کی طرف دیکھا جہاں اچار جن رِکھو اپنا بچہ لئے کھڑی تھی۔ رِکھو کے قریب پہنچ کر سپاہی بولا۔

" اماں ! کیا تم مجھے اپنا للا دے سکو گی؟"

رِکھو گھبرائی، اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔

" صرف ایک منٹ کے لئے اماں!" سپاہی نے گڑگڑا کر کہا " صرف ایک پل کے لئے۔"

عورت نے کنول مچھلی کی طرح نرم اور گداز بچّہ سپاہی کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں دیدیا۔ سپاہی نے ایک پل کے لئے بچّے کو اچھی طرح گھورا۔ اس کی معتدل حرارت کو محسوس کیا۔ اسے بے تحاشا چوما، چھاتی سے بھینچا، رویا اور گرتا پڑتا سپاہیوں میں شامل ہونے کے لئے دوڑنے لگا۔

راجندر سنگھ بیدی

خودنوشت

میں، راجندر سنگھ بیدی، یکم ستمبر ۱۹۱۵ء کو لاہور چھاؤنی میں پیدا ہوا۔ تنخواہ ملنے کا دن تھا۔ ظاہر ہے گھر میں سب لوگ خوش ہوں گے۔ بچپن کا پہلا حصہ دیہات میں اور بقیہ لاہور میں گزرا۔ کچھ دیر ایک ریاست میں بھی رہا۔ شمال میں درہ خیبر اور جنوب مشرق میں علیگڑھ سے پرے سفر نہیں کیا۔ ایف۔ اے تک تعلیم پائی۔ ریاضی میں ہمیشہ اتنا ہی کمزور رہا، جتنا ادبیات میں اچھا۔

والد کھشتری تھے۔ والدہ برہمن۔ ذات پات کی پابندیوں کے دنوں میں ان کی شادی کیونکر ہوئی یہ آج تک صیغۂ راز میں ہے اتنا جانتا ہوں کہ یہ اتصال قطعاً رسمی تھا۔ والد صاحب خوبصورت انسان تھے اور والدہ بدصورت تھیں۔ قدرت کی ستم ظریفی سمجھئے کہ دونوں میں جو چیز بری تھی وہ ہم بہن بھائیوں کے حصے میں آئی۔

شکلوں کے اس تضاد کے باوجود میرے والدین میں بہت ہم آہنگی تھی۔ ہمارا وجود اس کا نتیجہ محض نہیں بلکہ اس اتصال سے جو کچھ ظاہر ہوا وہ میرے افسانے ہیں۔ والد صاحب رات کو دیر تک والدہ کو دو پیسے روزانہ کرایہ کے ناول شرلک ہومز کے کارنامے اور ٹاڈ راجستھان سُنایا کرتے تھے اور ہم بچے بستروں پر دبکے ہوئے سنا کرتے۔

والد صاحب کی ایک دو عادتیں مجھے بیک وقت اچھی اور بری لگتی تھیں۔ بات بات پر فارسی کے اشعار پڑھنا اور پڑھتے پڑھتے رونے لگنا اور والدہ کی اپنی سہیلیوں میں ہر دلعزیزی۔ ہمارے گھر میں بہت شور بپا ہوتا تھا۔ شور، شور، شور — اور اس کے بعد یکلخت رات کا سناٹا اور بھی بڑا شور سنائی دیتا تھا۔

شروع میں انگریزی اور پنجابی میں لکھنا شروع کیا۔ لیکن اپنے پڑھنے والوں کا حلقہ وسیع کرنے کی غرض سے اردو میں لکھنے لگا۔ پہلے مقبول عام افسانے "بھولا"، "گرم کوٹ"، "ہاں شاپ"، "دس منٹ بارش میں" اور "ہمدوش" وغیرہ تھے۔ پھر وہ کتابی صورت میں "دانہ و دام" کے نام سے شائع ہوئے۔ کتاب اتنی پسند کی گئی کہ اردو کی متعدد کتابوں کی طرح تین سال میں اس کا پہلا ایڈیشن بھی نہیں بک سکا۔ (میرے پبلیشر بالکل ایماندار ہیں!)

طبیعت میں تلون زیادہ ہے۔ انقلاب کو اپنی زندگی کا قانون سمجھتا ہوں۔ ایک جگہ اور ایک صورت میں دیر تک نہیں بیٹھ سکتا۔ اپنے کمرے میں بھی میز کو کبھی ایک کونے میں اور کبھی دوسرے کونے میں رکھ دیتا ہوں۔ چنانچہ پہلے پوسٹ آفس میں ملازم تھا۔ آٹھ سال کی ملازمت کے بعد پوسٹ آفس چھوڑ دیا۔ کچھ مہینے آوارہ گردی کی اور پھر ریڈیو میں ملازم ہوگیا۔ اور اب.. . .....

میں محض افسانے نہیں لکھتا میرے تین بچے ہیں، ایک مرچکا ہے۔ ایک بیوی ہے۔ گو ادب میری پہلی محبت ہے۔ جی چاہتا ہے کوئی امیر بیوہ مجھ سے شادی پر رضامند ہو جائے یا کوئی متمول آدمی مجھے (بہ ایں ہمہ بیوی بچے) متبنّٰی بنا لے تو میں آرام سے بیٹھا کروں۔

(ماخوذ از "میرا پسندیدہ افسانہ" مرتبہ بشیر ہندی لاہور (سنہ ندارد)

علامہ اقبال کی شخصیت اور فن پر لکھی جانے والی پہلی کتاب

اقبال

مصنّفہ: احمد دین (مصنّف سرگزشت)

مرتّبہ: مشفق خواجہ

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۳ء میں طبع ہوئی تھی اور اس ایڈیشن کے تمام نسخے جلا دیے گئے تھے۔ دوسری مرتبہ یہ کتاب ۱۹۲۶ء میں ترمیموں اور اضافوں کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ نئے ایڈیشن میں متن ۱۹۲۶ء کے ایڈیشن پر مبنی ہے اور ۱۹۲۳ء کے ایڈیشن کے تمام حذف شدہ مباحث اور اختلافات کو کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

کتاب کے شروع میں مرتّب نے طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں احمد دین کے حالاتِ زندگی ادبی کاموں اور علامہ اقبال سے تعلقات کی تفصیل پیش کی گئی ہے

صفحات: ۵۲۸ قیمت: ۴۰ روپے

انجمن ترقی اردو پاکستان بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

محمد سلیم الرحمٰن

اندیشۂ گرمی

(یہ مضمون انگلستان کے اخبار "دی آبزرور" میں شائع ہونے والے ایک مضمون کا آزاد ترجمہ ہے۔ مضمون کے مصنف کا نام جیوفری لینن ہے۔ ان میں جن مسائل کا ذکر آیا ہے ان سے اہلِ پاکستان بے خبر تو نہ ہوں گے لیکن اکثر اوقات انہیں قابلِ توجہ نہیں سمجھتے۔ بہت سے لوگوں کے خیال میں یہ مسائل ایسے ہی ہیں جیسے دور افق پر بجلی چمکتی نظر آئے اور دیکھنے والا یہ سوچ کر مطمئن ہو جائے کہ کوئی اور جگہ طوفانِ برق و باراں کی زد میں ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ یہ مسائل اگر ہمیں آج درپیش نہیں تو کل اچانک اپنی شدت کا احساس دلائیں گے اور اس وقت ہم سے کچھ بن نہ پڑے گا۔ چھوٹی چھوٹی خرابیاں مل کر کسی بہت بڑی خرابی میں تبدیل ہوتی ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ آشوب تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ "دیکھ رفتارِ انقلاب فراق : کتنی آہستہ اور کتنی تیز!"

م۔س)

جنوبی بحر الکاہل میں توالو نامی ایک ملک ہے۔ ملک کیا ہے، یوں سمجھئے، ننھے ننھے جزیروں میں مالا سی سمندر میں بکھری ہوئی ہے۔ توالو کے وزیر اعظم نے کچھ عرصہ پہلے اقوام متحدہ کو خط لکھا۔ خط کے لہجے کا رسمی انداز اور بے نیازی کی حد کو چھوتی ہوئی دل جمعی قابلِ داد ہے۔ وزیر اعظم نے کہا کہ از راہ کرم توالو کو مطلع کیا جائے کہ آیا ملک کا سمندر میں غرق ہونا مقدر ہو چکا ہے۔ اس وضاحت سے آئندہ کے لئے منصوبہ بندی میں مدد ملے گی۔ خط میں مزید کہا گیا ہے کہ یہ خبر ان جزیروں تک بھی پہنچ چکی ہے کہ ماحول کی آلودگی کی وجہ سے دنیا گرم ہوتی جا رہی ہے۔ چونکہ ان جزیروں میں سے شاید ہی کوئی سطح سمندر سے چودہ فٹ اونچا ہو اس لئے امکان یہی ہے کہ یہ چھوٹا سا ملک بالآخر سمندر برد ہو جائے گا۔

یہ تو ایک خط تھا۔ لیکن اقوام متحدہ کے ماحولی پروگرام کے صدر دفتر میں، جو نیروبی میں واقع ہے، ایسے خطوں کا انبار لگا ہوا ہے۔ جوں جوں یہ شواہد سامنے آ رہے ہیں کہ دنیا کے موسم میں اتنی بڑی تبدیلی آنے والی ہے، جس کی کوئی نظیر پچھلے ایک لاکھ سال میں نہیں ملتی لوگوں کی تشویش بڑھ رہی ہے۔

بحرِ ہند میں واقع مالدیپ کے ملک کو، جو ایک ہزار ایک سو چھیانوے جزائر پر مشتمل ہے، سب سے زیادہ فکر لاحق ہے۔ بیشتر جزیرے سطح سمندر سے بمشکل چھ فٹ بلند ہیں۔ پچاس سال کے اندر اندر سمندری طوفان انھیں روند ڈالیں گے۔ مالدیپ کے صدر کا کہنا ہے کہ مالدیپ کا وجود تو ابھی خطرے میں پڑ چکا ہے۔

اس گرمی کی آنچ صرف چھوٹے چھوٹے جزیروں تک ہی نہیں پہنچ رہی۔ یہ گرم شدگی، جو کاربن ڈائی آکسائڈ اور بعض دوسری گیسوں کی وجہ سے ظہور میں آئی ہے اور جسے "سبز خانہ[1] اثر" کا نام دیا گیا ہے۔ جلد ہی برطانیہ اور دنیا کے باقی حصوں میں بھی اپنا بربادی کا کھیل کھیلے گی۔

تین ہفتے پہلے ناسا کے سب سے نامی گرامی موسمیاتی ماہر ڈاکٹر جیمز ہنسن نے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی کانگریس کی ایک کمیٹی کے سامنے کہا کہ اسے ننانوے فی صد یقین ہے کہ سبز خانہ اثر اس زبردست خشک سالی کا ذمے دار ہے جس نے امریکا کے وسطی مغربی علاقے میں تباہی مچادی ہے۔ تقریباً پچاس سال بعد امریکہ کو ایسی خشک سالی سے سابقہ پڑا ہے۔ کوئی پندرہ دن پہلے ٹورنٹو میں ہونیوالی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں بھی، جسے کینیڈا کی حکومت نے طلب کیا تھا۔ اس قسم کی تنبیہات کی گونج سنائی دی۔ اس بارے میں اب سائنسی اجماع پایا جاتا ہے کہ اگر فوری طور پر کوئی قدم نہ اُٹھایا گیا تو دنیا کو ایسی تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا جس کی کوئی مثال نہ ملے گی۔

پچھلے دس برسوں کے دوران میں ناحال دنیا کو اس صدی کے چار گرم ترین برسوں سے واسطہ پڑا ہے۔ یہ گرم ترین سال ۱۹۸۰ء، ۱۹۸۱ء، ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۷ء تھے۔ جب سے قابل اعتبار موسمی اعداد و شمار جمع کیے جانے کا رواج ہوا ہے تب سے ۱۹۸۰ء کو چھوڑ کر، آخری تین سال گرم ترین تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گرمی کے لحاظ سے ۱۹۸۸ء انھیں بھی پیچھے چھوڑ جائے گا۔

پچھلے سال برطانیہ کو جس دل ہلا دینے والے موسم گرما کا سامنا کرنا پڑا اس سے ان عالمی اوسطوں پر حرف نہیں آتا۔ موسمیات داں کہتے ہیں کہ جب بڑی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں تو موسم کی حالت وہی ہو جاتی ہے جو اس محاورے میں بیان کی گئی ہے کہ "گھڑی میں اولیا، گھڑی میں بھوت" اس لئے عمومی رجحان گرم شدگی کا سہی دنیا کے بعض علاقے غیر معمولی طور پر واہیات موسم کا شکار رہیں گے۔

کیمبرج یونیورسٹی میں ہونیوالی تحقیق سے انکشاف ہوا ہے کہ سبز خانہ اثر سے برطانوی پودوں اور درختوں میں تبدیلی آنی شروع بھی ہو چکی ہے۔ آسٹریلوی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ دنیا کی تین چوتھائی ساحلی ریتیلی پٹیوں کو سمندر کاٹ کر بہالے گیا ہے۔ اس کا ذمے دار بھی جزوی طور پر گرم شدگی کو ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں امریکی سائنس دانوں نے پتا چلایا ہے کہ پچھلے سو برس کے دوران میں قطب شمالی کے گرد و نواح کا مستقیلا (PERMAFROST) کوئی تین درجہ سنٹی گریڈ تک گرم ہو چکا ہے۔

یہ خطرے کی چند اولین گھنٹیاں ہیں جو آنے والے عالمی بحران کی خبر دے رہی ہیں۔ خطرہ دو طرف سے ہے۔ ایک تو یہ کہ مملکتہ موسمی تبدیلی کا پھیلاؤ کتنا ہوگا اور دوسرے یہ کہ وہ کس رفتار سے واقع ہوگی۔ جس آب و ہوا نے تمدن اور زراعت کے فروغ میں مدد دی ہے۔ اور جس کی رعایت سے ہماری فصلیں اگتی ہیں اور رسمیں اور تعمیریں وجود میں آتی ہیں وہ یقیناً صفحۂ دنیا سے مٹ جائیں گی۔ دنیا شاید اتنی زیادہ گرم ہو جائے جتنی انسانیت کے ظہور کے بعد سے آج تک نہ ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سانحہ اگلے چالیس برسوں کے دوران پیش آئے گا۔

انسانیت خود کو نئی صورت حال کے مطابق ڈھالنے میں دشواری محسوس کرے گی خصوصاً ایسی دنیا میں جو قومی سرحدوں میں بٹی ہوئی ہے اور جہاں مسابقت پر مبنی مفادات کا زور ہے۔ قدرتی نظاموں کے لیے بدلتے ہوئے حالات سے نباہ کرنا اور بھی دشوار ہوگا۔ اقوام متحدہ کے ماحولی پروگرام کے ایک ناظم نے کہا ہے کہ "ماحولی نظام جو زیادہ سے زیادہ تبدیلی برداشت کر سکتے ہیں آنے والی تبدیلی

---

[1] "سبز خانہ" یا "شیشہ باغ" جسے پودوں کی کاشت اور نمائش کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس میں حرارت اور نمی وغیرہ مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔

کی شرح اس سے دس گنا زیادہ ہوگی۔"

اس خطرے کی طرف توجہ آج سے ایک سو ساٹھ سال پہلے دلائی گئی تھی۔ ۱۸۲۷ء میں فرانسیسی ریاضی داں، بیرن جوزیف فوریئر نے بتایا تھا کہ کاربن ڈائی آکسائڈ کس طرح ہوا پسر کو گرم کرتی ہے اور خبردار کیا تھا کہ انسان آب و ہوا پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ پچھلی صدی کے آخر میں عظیم سوئیڈش سائنس داں، "سانتے ارہینیس" نے "سبز خانہ اثر" کی ترکیب گھڑی۔ تقریباً اسی زمانے میں فرانسیسی ناول نگار ژول ورن نے اپنی تحریروں کے ذریعے سے بتایا کہ سمندر کی سطح بلند ہو جانے سے کیا نتائج مرتب ہوں گے۔

ہوا پسر میں موجود کاربن ڈائی آکسائڈ وہی فعل انجام دیتی ہے جو سبز خانے میں لگے ہوئے شیشے کرتے ہیں۔ وہ سورج کی شعاعوں کو گزر کر زمین تک پہنچنے تو دیتی ہے لیکن ان سے پیدا ہونے والی کچھ گرمی کو روک لیتی ہے۔ اگر کاربن ڈائی آکسائڈ نہ ہوتی تو یہ گرمی منعکس ہو کر واپس خلا میں چلی جاتی۔ ایسی صورت میں دنیا کا درجہ حرارت اوسطاً اٹھارہ درجے سنٹی گریڈ تحت صفر ہو جاتا اور اس کا موجودہ حیوباتی نظام پنپ ہی نہ سکتا۔ خوش قسمتی سے کاربن ڈائی آکسائڈ کی قدرتی تہیں حرارت کو پندرہ درجے سنٹی گریڈ جیسے آرام دہ مقام پر رکھتی ہیں اور یوں کرۂ ارض پر زندگی کو پھولنے پھلنے کا موقع مل جاتا ہے۔

لیکن جوں جوں زیادہ سے زیادہ کاربن ڈائی آکسائڈ ہوا پسر میں پہنچ رہی ہے دنیا گرم سے گرم تر ہوتی جا رہی ہے۔ ہم ہر سال تیل، گیس اور کوئلہ جلا کر تقریباً ۵ ارب چالیس کروڑ ٹن کاربن ڈائی آکسائڈ خارج کرتے ہیں اور اس مقدار میں ہر سال تقریباً دس کروڑ ٹن کا اضافہ ہو رہا ہے۔ درختوں کی کٹائی سے، خصوصاً استوائی برکھا نیوں کی کٹائی سے صورتِ حال اور مخدوش ہو گئی ہے۔ زندہ درخت کاربن ڈائی آکسائڈ جذب کرتے رہتے ہیں۔ جب انھیں کاٹا اور جلایا جاتا ہے تو مقید کاربن ڈائی آکسائڈ رہا ہو جاتی ہے۔ برید و سوخت کے اس عمل سے ہر سال ڈیڑھ ارب ٹن مزید کاربن ڈائی آکسائڈ ہوا میں شامل ہو جاتی ہے۔

ایروسول پھواروں، فاسٹ فوڈ کارٹنوں اور ریفریجریٹروں میں استعمال ہونے والی گیسوں کا ہر سالمہ کاربن ڈائی آکسائڈ کے سالمے کی بہ نسبت دس ہزار گنا زیادہ گرمی اپنے میں مقید کر سکتا ہے۔ نائٹرس آکسائڈوں (جو کیمیاوی کھادوں سے خارج ہوتی ہیں) میتھین (جو کوڑے کے ڈھیروں، دھان کے کھیتوں اور گایوں کے معدے میں بنتی رہتی ہے) کی مقدار بھی ہوا میں برابر بڑھ رہی ہے۔ یہ گیسیں مل کر کاربن ڈائی آکسائڈ کے اثر کو دوچند کر رہی ہیں۔

امریکی کیمیا داں، ولیس بروے کار کا کہنا ہے: "کرۂ ارض کے ساکنان بڑی خاموشی سے ایک عظیم الشان ماحولی تجربے میں مصروف ہیں۔ اگر اسے منظوری کے لیے کسی ذمے دار مجلس کے سامنے پیش کیا جائے تو بڑی سختی سے مسترد کر دیا جائے، صرف اس بنا پر کہ اس کے نہایت خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔"

چوٹی کے سائنس داں اب اس بارے میں متفق ہیں کہ اس تجربے نے پچھلے سو سال میں دنیا کی گرماہٹ کو تقریباً نصف درجہ سنٹی گریڈ تک بڑھا دیا ہے۔ اس بارے میں بھی اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ اگر اس تجربے پر کوئی قدغن نہ لگائی گئی تو ممکن ہے کہ ۲۰۳۰ء تک گرمی میں ڈیڑھ سے ساڑھے چار درجے سنٹی گریڈ کا مزید اضافہ ہو جائے۔ قرینِ قیاس یہ ہے کہ یہ اضافہ، بہر صورت، تین درجے سنٹی گریڈ سے زیادہ ہی ہوگا۔

یہ درجۂ حرارت متمدن انسان کے تجربے سے باہر کی بات ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ میں آج کے مقابلے میں زیادہ گرمی پڑتی تھی، جنوبی

انگلستان میں انگور کی بیلیں اُگتی تھیں۔ شمالی یورپ کے جن مہم جوؤں نے گرین لینڈ دریافت کیا تھا وہ انھیں سچ مچ سبزستان نظر آیا تھا۔ جنوبی امریکہ کی مایا تہذیب کا کام شاید اسی گرمی نے تمام کیا ہو۔ لیکن اس وقت بھی درجۂ حرارت آج کے درجۂ حرارت سے صرف نصف درجہ زیادہ تھا۔

اگلے چالیس برسوں میں جو درجہ ہائے حرارت متوقع ہیں، ان کی نظیر تلاش کرنے کے لیے کم از کم سوا لاکھ سال پیچھے جانا پڑیگا جب آب و ہوا آج کی بہ نسبت دو سے ڈھائی درجے زیادہ گرم تھی اور انگلستان میں ہاتھی، شیر ببر اور دریائی گھوڑے گھومتے نظر آتے تھے۔ پچھلے بیس لاکھ سال کے دوران میں دنیا آج سے تین درجہ زیادہ گرم کبھی نہیں رہی لیکن اب صورت حال بدلا چاہتی ہے۔ اگر موجودہ رجحان برقرار رہا تو سو سال سے بھی کم میں دنیا آج کے مقابلے میں ۶ء۸ درجے زیادہ گرم ہو چکی ہوگی۔ یہ اضافہ بہت بھاری ہے۔

جن نتائج کی پیش گوئی ممکن ہے ان میں ایک تو بالکل بدیہی ہے۔ سمندر کی سطح بلند ہو جائیگی۔ پانی گرم ہونے پر پھیلتا ہے۔ یخ اور برف پگھل جاتے ہیں۔ اس بارے میں بھی سائنسی حلقوں میں اجماع پایا جاتا ہے کہ ۲۰۳۰ء تک سمندر کی سطح آٹھ انچ سے ساڑھے چار فٹ تک بلند ہو چکی ہوگی۔ سطح سمندر صرف ایک فٹ بلند ہونے سے امریکہ کے خلیجی اور اوقیانوسی ساحلوں پر بیشتر ریتلی پٹیاں کٹ کر بہہ جائیں گی جن سے املاک کو زبردست نقصان پہنچے گا۔ ٹورنٹو میں ہونے والی موسمی کانفرنس کو بتایا گیا کہ تین فٹ اضافے سے مصر کے قابل کاشت علاقے کا چھٹا حصہ زیر آب آجائے گا اور اسی لاکھ آدمی بے گھر ہو جائیں گے۔ بنگلہ دیش میں ڈیڑھ کروڑ لوگ گھر بار اور روزگار سے محروم ہو جائیں گے۔ نیو اورلی اینز، شنگھائی اور قاہرہ میں پانی بھر جائے گا۔ وینس کی شان و شوکت پر پانی پھر جائے گا۔ ایشیا کے بہت سے ایسے علاقے، جو دھان اُگانے کے لئے بہترین تصور کئے جاتے ہیں اور نچلے میدانوں اور ڈیلٹاؤں میں واقع ہیں، تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

دریائے ٹیمز پر بیریر تعمیر ہونے سے پہلے ایک مطالعہ اس غرض سے مکمل کیا گیا تھا کہ سیلاب آجانے کی صورت میں لندن پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ اس مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح کے آشوب سے شہر کے ۴۵ مربع میل متاثر ہوں گے اور تیرہ لاکھ افراد پر آفت آئے گی۔ السٹر یونیورسٹی کے ڈاکٹر بل کارٹر نے پچھلے سال برطانوی ایسوسی ایشن کو بتایا کہ سبز خانہ اثر سے بیشتر لندن، ٹیمز کی کھاڑی اور بہت سے ساحلی شہر ڈوب جائیں گے۔ بیلفاسٹ، ڈبلن اور ایبرڈین کے بعض حصوں میں بھی پانی بھر جائے گا۔ کل ملا کر برطانیہ اور آئرستان میں ڈیڑھ کروڑ آدمی بے گھر ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر کارٹر کچھ زیادہ ہی مایوس نظر آتے ہیں۔ بیشتر ماہرین کی رائے میں اس قسم کی قیامت خیز غرقابی کی اگلی صدی کے آخر تک توقع نہیں۔ لیکن اگر اس گرم شدگی سے مغربی قطب جنوبی کی یخ چادر، جو غیر مستحکم ہونے کے لئے بدنام ہے، پگھل گئی تو قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ سمندر کی سطح چھبیس فٹ بلند ہو جائے گی۔

بہر حال، اغلب یہ ہے کہ سیلاب زدگی سے اتنا ضرر نہیں پہنچے گا۔ دنیا کی ہواؤں، بارشوں اور سمندری دھاروں میں تبدیلیاں کہیں زیادہ نقصان دہ ثابت ہوں گی۔ زمین کہیں سے کم کہیں سے زیادہ گرم ہونے لگے گی۔ استوائی علاقوں کی بہ نسبت قطبین زیادہ تیزی سے گرم ہوں گے۔ اس سے غالباً موسم کہیں زیادہ طوفانی ہو جائیں گے۔ آب و ہوا یقینی طور پر ڈرامائی انداز میں بدل جائیگی۔

یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ سب سے زیادہ اثر کن علاقوں پر پڑیگا یا اس اثر کی نوعیت کیا ہوگی۔ جو بہترین سائنسی اندازے لگائے گئے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے غلہ خیز علاقے، امریکہ کے وسطی مغربی علاقے اور روس کے مرغزار رفتہ رفتہ زیادہ خشک ہوتے جائیں گے۔ اس وجہ سے اناج کی پیداوار میں بہت کمی واقع ہو جائے گی۔ مغربی یورپ میں بھی فصلوں کے خراب ہو جانے کی

توقع ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بارشیں شمال کا رخ کر کے کینیڈا، سکینڈے نیویا اور سائبیریا پر برسنے لگیں لیکن ان علاقوں کی مٹی میں اتنی جان نہیں کہ وہ دنیا کے موجودہ غلّہ خیز خطوں کا نعم البدل ثابت ہو سکیں۔ افریقہ کے خشک علاقوں میں قحط مزید رنگ لائے گا اور اس کے مغربی ممالک تک پھیل جانے کا بھی خاصا امکان ہے۔

برطانیہ کے موسم کے بارے میں کوئی پیش گوئی کرنا ہمیشہ کی طرح بہت ہی مشکل کام ہے۔ ایک منظرنامے میں دکھایا گیا ہے کہ ملک گرم تر ہو جائے گا۔ انگور کی کاشت پھلے پھولے گی لیکن کاکس نامی سیب کا نام و نشان مٹ جائے گا۔ ایوی مور میں برف کی کمی کی وجہ سے سکی بازی کا سلسلہ بند ہو جائے گا اور شمالی اسکاٹ لینڈ کے فلو کنٹری کی جنگل کاری کے بارے میں جو تلخ و تند بحث چھڑی ہوئی ہے وہ بھی اپنی موت مر جائیگی۔ آب و ہوا اتنی تند گرم ہو جائے گی کہ کونیفر درختوں کو راس نہ آسکے گی اور اتنی خشک ہو جائیگی کہ جنگلی زندگی پنپ نہ پائے گی۔ چناں چہ نہ درخت بچیں گے نہ جنگلی زندگی۔

ایک اور منظرنامے میں تجویز کیا گیا ہے کہ برطانیہ اور بیش تر مغربی یورپ درحقیقت زیادہ سرد ہو جائیں گے کیوں کہ گلف سٹریم نامی دھارا رخ بدل کر ان کے ساحلوں سے دور چلا جائے گا۔ دنیا بھر کی جنگلی زندگی کی جان پر آبنے گی۔ بود و ماند کی جگہیں بدلتی ہوئی آب و ہوا سے نباہ نہ کر پائیں گی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سبز خانہ اثر سے نمٹنا انتہائی مہنگا ثابت ہوگا۔ صرف میل بھر کی سمندری دیوار تعمیر کرنے پر ایک ارب پاؤنڈ (تقریباً تیس ارب روپے) خرچ آتا ہے۔ ہالینڈ اپنے کل سرمائے کا جتنا حصّہ ملک کو سمندر سے بچائے رکھنے پر خرچ کرتا ہے وہ تناسب کے اعتبار سے اس رقم سے زیادہ ہے جتنی ریاستہائے متحدہ امریکہ کو اپنے دفاع پر صرف کرنی پڑتی ہے۔ اس قسم کی شاہ خرچی، غریب ملکوں کی بساط سے باہر ہے۔ امیر ملکوں کو بھی کھربوں پاؤنڈ خرچ کرنے پڑیں گے۔ ایک تخمینے کے مطابق ۲٫۵ درجے کے اضافے سے نمٹنے کے لئے دنیا کی ہر سال کی اقتصادی پیداوار کا تین فیصد کھپ جائے گا۔ یہ شرح اقتصادیات کی کمر توڑ سکتی ہے۔

ایک اور المناک بات، جس پر سائنسی اجماع پایا جاتا ہے، یہ ہے کہ گرم شدگی اب "ناگزیر" ہے۔ واشنگٹن میں عالمی وسائل کے انسٹی ٹیوٹ کے ایک مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر سبز خانہ اثر کے دفعیہ کی کوئی بالجزم کوشش بھی کی جائے تو اس کا نتیجہ صرف یہ برآمد ہوگا کہ جو گرم شدگی ۲۰۳۰ء میں متوقع ہے وہ تیس سال سے ساٹھ سال تک کے لیے ٹل جائے گی۔

لیکن یہ مہلت بھی خریدنے کے لائق ہے۔ اس سے ہمیں موقع ملے گا کہ خود کو نئی صورت حال کے مطابق ڈھال لیں۔ ایسی فصلیں تیار کریں جن میں خشک سالی کا مقابلہ کرنے کی سکت ہو۔ چڑھتے سمندر کے آگے بند باندھ سکیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ان ایندھنوں کے جلانے میں کمی کی جائے جو زمین میں سے نکالے جاتے ہیں (مثلاً پٹرولیم، پتھر کوئلہ) ٹورنٹو کانفرنس کے مندوبین نے کہا ہے کہ اگلے سترہ برس میں ان ایندھنوں کے صرف میں بیس فی صد کمی کی جانی چاہیے۔

نیوکلیئر توانائی کو مزید ترقی دینا شاید کارآمد ثابت ہو لیکن اس توانائی کے اپنے خطرات ہیں اور اسے مطلوبہ تیزی سے بڑھانا ممکن بھی نہیں۔ قابل تجدید توانائی، مثلاً ہوائی یا شمسی توانائی، ماحولیاتی نقطۂ نظر سے زیادہ پرکشش ہے لیکن ابھی بخوبی ترقی یافتہ نہیں۔

بہترین امید یہ ہے کہ توانائی کو بڑی کفایت شعاری سے صرف کیا جائے۔ جاپان، جو دنیا کی کامیاب ترین معیشت ہے

امریکہ کے مقابلے میں فی کس نصف توانائی استعمال کرتا ہے اور اس شرح کو بہتر بنانا ممکن ہے۔ جنگلوں کی کٹائی روک کر نئے جنگل لگانا ابھی سے سودمند ثابت ہو سکتا ہے کہ نئے جنگل کاربن ڈائی آکسائڈ جذب کرلیں گے۔ لیکن جو قدم بھی اُٹھانا ہے۔ اس میں اب دیر نہ کی جائے ورنہ پانی پیچ پچ، سر سے گزر جائے گا۔

اس بارے میں بین الاقوامی معاہدے کی ضرورت ہے لیکن حکومتوں سے یہ بات منوانا کہ وہ ایندھن کے استعمال میں فضاکارانہ طور پر کمی کردیں نہایت مشکل ہے۔ بہرکیف، اگر حکومتیں سخت تدابیر اختیار نہیں کریں گی اور وہ بھی فی الفور تو کچھ عرصے بعد ان کے پاس ڈوبتی دنیا کو بچانے کے لیے تنکوں کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

(طوفانوں، سیلابوں، خشک سالیوں اور دوسری آفتوں سے معمور یہ منظر نامے وہ بیج ہیں جو ہم بے فکری اور بے عقلی سے بوئے چلے جارہے ہیں اور جن سے اُگنے والی کھیتی کو ہماری آنے والی نسلیں لہولہان ہوکر کاٹیں گی اور ہمیں "دعائیں" دیں گی۔ مگر یہاں کل کا ہوش ہی کسے ہے۔ بیسویں صدی میں جو کچھ دیکھنے میں آیا ہے اور آئے گا اس کے بارے میں فارسی کا یہی مصرع دہرایا جاسکتا ہے: تو کارِ زمیں را نکو ساختی۔ م۔س)

غزل نما

قدیم شعرا کا تعارف و انتخاب کلام

ادا جعفری

قومی زبان" میں شائع ہونے والے انتخابات

کتابی شکل میں

شائع ہو گئے ہیں

انجمن ترقی اردو پاکستان، بابائے اردو روڈ کراچی ۱

رام لعل

آبِ حیات اور طنز و مزاح

یوں تو طنز و مزاح کی تعریف و تشریح اپنے اپنے انداز سے کئی نقادوں نے کی ہے جن میں اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے اہلِ قلم بھی شامل ہیں اور طنز و مزاح دونوں میں ہنسی، ایک قدرِ مشترک ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس کی وضاحت یوں کی ہے:

> "دراصل ہنسی اس فرد کا مذاق اڑاتی ہے جو سوسائٹی کی سیدھی لکیر سے ذرا ہٹ کے اور اس غرض سے اڑاتی ہے کہ وہ پھر سے اس لکیر میں شامل ہو جائے۔ یہ بات طے ہے کہ ہنسی ایک ایسی لاٹھی ہے جس کی مدد سے سوسائٹی کا گلّہ بان محض غیر شعوری طور پر ان تمام افراد کو ہانک کر اپنے گلے میں دوبارہ شامل کرنے کی سعی کرتا دکھائی دیتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے سوسائٹی کے گلے سے بھٹک رہے تھے۔ یعنی ہنسی ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعہ سوسائٹی ہر اس فرد سے انتقام لیتی ہے جو اس کے ضابطۂ حیات سے بچ نکلنے کی سعی کرتا ہے۔"

میرے خیال میں ہنسی کی طنز و مزاح کے حوالے سے اس سے زیادہ جامع اور واضح تعریف نہیں کی جا سکتی۔ طنز و مزاح کا مقصد کسی کے ساتھ محض کھٹھول کر کے خوش ہونا یا دوسرے کی دل آزاری کر کے ایک شیطانی حظ حاصل کرنا ہرگز نہیں ہوتا۔ اگر کوئی اس نیت سے قلم اٹھاتا ہے تو اس کی تحریر اور کسی دائرے میں پہلے ہی آتی ہو، ادب کے دائرے میں ہرگز نہیں رکھی جا سکتی طنزیات کے مفہوم کے بارے میں رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ "اس کا مقصد یہ ہے کہ کسی بے ہنگام یا مضحکہ خیز واقعہ یا حالت پر ہمارے جذبۂ تفریح یا نفرت کو تحریک ہو اور اسے ادبی حیثیت بھی حاصل ہو۔ اگر ان حقیقتوں کا فقدان ہو تو پھر یہ گالی گلوج اور دہقانوں کی طرح منہ چڑاتا ہوگا۔"

یہ محض اتفاق ہے کہ اردو میں کسی بھی طنز نگار یا مزاح نگار کے یہاں خالص طنز یا خالص مزاح کم کم ملتا ہے۔ بقول ڈاکٹر شمع افروز زیدی۔ "بہ نظرِ غائر دیکھنے سے طنز و مزاح کا چولی دامن کا ساتھ نظر آئے گا۔" اس کے لیے ملکی حالات کا پروردہ ہمارے ادیبوں کا قنوطی مزاج ذمہ دار ہے جو اکثر و بیشتر طنز و مزاح کی الگ الگ سرحدوں میں دخل انداز ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ طنز یا مزاح تخلیق کرنے وقت ایک طرح کی SUSTAINED EFFORT سے لاشعوری طور پر بے نیاز رہتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی جو ہمارے عہد کے ایک نمائندہ طنز و مزاح نگار کہے جاتے ہیں، کے

بدمن مضامین کے اختتام پہ ایک المیہ تک کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ شاید اس لیے کہ طنز بذاتِ خود ایک قسم کے المناک واقعے یا ناپسندیدگی کی کیفیت سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی دروناکی پہ شدید چبھن سے بچنے کی خاطر ہمارے طنز نگار ایک شائستہ مزاح کی آڑ لینے پہ مجبور ہو جاتے ہیں تاکہ وہ خوش گواری کی فضا قائم رہے۔

مجھے ان معروضات سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جس طرح ادب کی تخلیق کا چاہے وہ افسانہ ہو یا شعر، کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے، اسی طرح طنز یا مزاح کی تخلیق میں بھی کوئی نہ کوئی مقصد ضرور پنہاں ہوتا ہے۔ ادب محض تفریح کا اظہار نہیں ہے۔ وہ انسان کے بنیادی اور انفرادی احساسات۔ مثلاً ہمدردی، محبت، تنہائی، بیزاری، مسرت، جنسی ناآسودگی، قتل کا جذبہ وغیرہ، کئی طرح کی خواہشات کا اظہار ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ان کا بلا واسطہ یا بالواسطہ معاشرے سے کوئی تعلق نہ ہو۔ یعنی سماجی حقیقت بہرحال شعر و افسانے کی واردات، ماجرہ، استعارہ، تشبیہ یا علامت سے عیاں ہو گی۔

سید احتشام حسین نے طنز کے سلسلے میں جو وضاحت کی ہے وہ اس حقیقت تک پہنچنے میں ہماری پوری طرح رہنمائی کرتی ہے:

> "جو چیز طنز کے سلسلے میں سب سے زیادہ غور طلب ہے وہ طنز اور حقیقت کا تعلق ہے۔ حقیقت کا ادراک کیے بغیر طنز پیدا ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ اگر کسی کے پاس حقیقت کا کوئی تصور نہیں ہے تو وہ کسی قسم کے توازن کی جستجو کر ہی نہیں سکتا۔ طنز کے لیے حقیقت کے ایک ایسے مرکز کی ضرورت ہے جس سے گھٹنا یا بڑھنا اس عمومیت اور توازن میں فرق ڈالتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شخص طنز کا حربہ استعمال نہیں کر سکتا۔ طنز نگار کے پیشِ نظر حقیقت کا ایک عقلی اور مادّی تصور ضرور ہونا چاہیے۔"

لکھنؤ کے طنز و مزاح کے اوّلین دور کے بارے میں بعض نقّادوں نے عام طور پہ اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اس میں تکرارِ لفظی، پھکڑپن، بھونڈے مذاق وغیرہ کی فراوانی تھی۔ لیکن اس حقیقت کو بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ہر دور کا ادب اپنے تاریخی اور سماجی حالات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لکھنے والے کے انفرادی رویّے بھی اس کے معاشرے اور معاشرے کے نفسیاتی محرکات سے بنتے اور بگڑتے ہیں۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ کوئی شہر یا علاقہ اپنی روایات سے اس قدر سختی سے عرصۂ دراز تک جڑا رہ جاتا ہے کہ وہ باہر سے در آنے والی تبدیلیوں کا ادراک رکھتے ہوئے بھی ان کا تجزیہ فوری طور پہ نہیں کر پاتا جس کی وجہ سے وہ دوسرے علاقوں کے تیز فہم لکھنے والوں سے پیچھے رہ جاتا ہے۔

مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں محسوس ہو رہی ہے کہ جس اودھ کی سرزمین نے منشی سید سجاد حسین رتن ناتھ سرشار، مچھو بیگ ستم ظریف، جوالا پرشاد برق وغیرہ جیسے کئی اہلِ قلم پیدا کیے اور انھوں نے طنزیہ و مزاحیہ ادب کی داغ بیل ڈالی یا اس صنفِ ادب کو مقبولِ عام بنانے میں ایک اہم کردار نبھایا۔ اسی سرزمین سے بعد کو دو ایک کو چھوڑ کر زیادہ بڑی تعداد میں اچھے طنز نگار اور مزاح نگار پیدا نہیں ہوئے۔ آزادی سے بہت پہلے سے اردو ادب کی دیگر اصناف میں طنز و مزاح کی ایک مستقل حیثیت تسلیم کی جا چکی ہے۔ میں تاریخ کے حوالوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا اس لیے کہ اس میں

بہت سی تحقیقی فروگزاشتیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ آزادی سے کچھ سال پہلے سے اردو ادب کی فضا میں کنہیا لال کپور، شوکت تھانوی، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، شفیق الرحمان، راجہ مہدی علی خاں، کرشن چندر۔ اور آزادی کے بعد فکر تونسوی، نذیر جعفری، ابن انشا، مشتاق احمد یوسفی، محمد خالد اختر، مجتبیٰ حسین، کرنل محمد خاں، احمد جمال پاشا وغیرہ کی وجہ سے جو خوشگواری قائم رہی ہے اس کو سنوارنے اور سجانے میں اودھ کے علاقے کا حصہ بہت ہی کم رہا ہے۔

یہ سب وہ لوگ ہیں جو سماجی و سیاسی حالات سے بھی متاثر ہوئے اور انھوں نے ملک کی تقسیم کے المیے کا بھی مشاہدہ کیا جس سے اردو کو بطور زبان ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ اس کے باوجود نئے حالات کا انھوں نے گہرائی سے مطالعہ کیا۔ معاشی و معاشرتی سطحوں پر ہونے والی حوصلہ شکنی کا بھی مقابلہ کیا اور طنز و مزاح کے لیے نئے نئے موضوعات تلاش کرتے رہے اور پوری صورتِ حال کو اپنے اپنے طرزِ فکر کے مطابق نہ صرف قابلِ برداشت بنانے میں مدد دی بلکہ بیشتر اوقات اس میں تبدیلیاں لانے کے لیے پڑھنے والوں کو ذہنی طور پر تیار کرنے کی خدمت بھی انجام دی۔

چند اقتباسات دیکھیے :-

"نینی تال میں بڑے آدمی کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کی نکیل کسی نہ کسی کتے کے ہاتھ میں ہوگی۔ ہر بڑے آدمی میں آپ کو ایک کتا جُتا ہوا نظر آئے گا۔ یہی کتے بڑے آدمیوں کو نینی تال کی جھیل کے چاروں طرف کھینچتے پھرتے ہیں۔ ایک سے ایک لاجواب کتا اور ایک سے ایک دل توانہ کتیا۔ کسی کا بوٹا سا قد، کسی کا موہوم سا دہانہ، کسی کی پتلی سی دُم، کسی کے جھڑے جھڑے سے بال۔ اور کوئی کتا بجائے خود بڑے آدمیوں کی شکل کا بارعب اور باوقار۔ مال روڈ پر ایک اجنبی کے لیے یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان میں سے بڑا کون ہے؟ کون کس کا پالتو ہے؟ کتا آدمی کا یا آدمی کتے کا؟ پھر یہ کہ جتنے کتے اور کتیاں ہیں وہ سب کی سب کر سچین۔ اس لیے کہ ان سے انگریزی بولی جاتی ہے۔ وہ ہندوستانی سمجھ ہی نہیں سکتے وہاں آدمی آدمیوں سے اس قدر میل جول نہیں رکھتا جس قدر انسان اور کتے میں یگانگت نظر آتی ہے۔ رہ گئے وہ لوگ جو بغیر کتے کے کھنچے ہوئے خود ہی مال روڈ پر رینگتے نظر آتے ہیں۔ ان کے متعلق نہ کتے کوئی اچھی رائے قائم کر سکتے ہیں نہ انسان۔"

(ناول "کُتیا"، از: شوکت تھانوی)

"ہم نے اپنی ساہتیہ اکادمی میں اس بات کا خاص انتظام کر رکھا ہے کہ کوئی ایسا ادیب اس میں گھسنے نہ پائے جس نے گزشتہ پندرہ بیس سال میں کوئی کام کی بات آسان زبان میں لکھی ہو۔"

(کرشن چندر)

"پانی کی اپنی جگہ پر کیا قیمت ہے؟ میرے ایسے گدھے تک اسے مفت پی لیتے ہیں لیکن جب

یہی پانی دودھ میں ملتا ہے تو اپنے سے چوگنی قیمت پاتا ہے۔ لکڑی کے بُرادہ کی اپنی جگہ کیا حیثیت ہے؟ لیکن یہی بُرادہ جب آٹے میں ملتا ہے تو دستر خوان کی زینت بن جاتا ہے۔ نفرت اپنی جگہ کتنا گھٹیا جذبہ ہے لیکن جب مذہب کی سان پر چڑھ جاتا ہے تو لاکھوں بے گناہوں کی جان لے لیتا ہے۔ تجارت کے اسی گُر سے نہ صرف دودھ کے دکاندار بلکہ مذہب کے تاجدار، سیاست کے ساہوکار بھی واقف ہیں۔"

("ایک گدھے کی سرگزشت" کرشن چندر)

"لیڈر ایک ایسا چیک ہے جس پر عوام دستخط کریں تو کیش ہو جاتا ہے ورنہ "ڈس آنر" ہو جاتا ہے۔" (فکر تونسوی)

"ایک پریشان بوڑھے نے خدا سے دعا مانگی۔

"اللہ تعالیٰ، میرے لیے موت بھیج دے۔"

دروازے پر کھٹ کھٹ ہوئی۔ بوڑھے نے پوچھا،

"کون ہو؟"

جواب آیا۔ "میں موت ہوں۔ آپ نے مجھے ابھی بلایا تھا"

بوڑھا گھبرا گیا۔ بولا "مگر میں نے تو اپنے بیٹے کو بلایا تھا"

جواب آیا۔ "میں آپ کا بیٹا ہی تو ہوں۔"

(فکر تونسوی)

فکر تونسوی کے ایسے بہت سے اقتباسات انور سدید نے ان کے کئی مضامین میں سے چھانٹ چھانٹ کر اپنے مضمون "فکر تونسوی کا مزاح" (مطبوعہ "نقوش" خاص نمبر دسمبر ۱۹۸۰ء) میں شامل کیے ہیں ——— انھوں نے لکھا ہے ——— فکر تونسوی نے آزادی سے پہلے کے دور میں سماجی انصاف اور معاشرتی انصاف کا خواب دیکھا تھا اور ایک مثالی نظام کو نئے ملک میں رائج کرنے کی آرزو کی تھی۔ آزادی کے بعد ان کا یہ آدرش یکسر ٹوٹ گیا۔ چناں چہ ان کے ہاں جو مجسم مایوسی اور دبیز بے چارگی نظر آتی ہے وہ ان حالات ہی کی زائیدہ ہے اور اس کے شدید ردِّ عمل نے ہی انھیں معاشرے کا مذاق اُڑانے پر آمادہ کیا اور وہ سنجیدہ شاعری سے طنز و مزاح کی طرف آ گئے۔

"نوّے سال تک ہم نے اپنی قومی جڑوں کی سینچائی کی تو ترشی تر شا کر ایک آزاد قوم کی شکل میں دنیا کے نقشے پر طلوع ہوئے۔ مگر آزادی کے سورج کی روشنی صرف میزبانوں کے باورچی خانوں پر پڑی۔ جمہوریت کا مطلع ابر آلود ہی رہا۔ من کی دنیا تن کی دنیا میں بدلی تو ہم نے بجائے دماغ کے معدے سے سوچنا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ ضعفِ معدہ میں مبتلا ہو گئے جہاں قومی کردار اگر کوئی تھا بھی تو ان گنت مرادآبادیوں اور جمشید پوریوں نے چیچک زدہ کر دیا۔" (احمد جمال پاشا)

"...کنور صاحب کے اطراف نہ صرف شاعر اور ادیب جمع رہتے ہیں بلکہ پہلوان اور فنِ پہلوانی سے تعلق رکھنے والے افراد بھی جمع رہتے ہیں اسی لیے میں ان کی محفل میں بہت محتاط رہتا ہوں کیوں کہ برابر بیٹھے ہوئے شخص کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مطلع عرض کرے گا یا گھونسہ رسید کرے گا۔ کسی اچھی بات پر مصافحہ کرے گا یا پنجہ لڑائے گا۔ گویا کنور صاحب کی ذات ایک ایسا گھاٹ ہے جس پر پہلوان اور شاعر دونوں ہی ایک ساتھ پانی پینے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کہتے ہیں....."

(کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، از: مجتبیٰ حسین)

"جناب احسان دانش کو حال ہی میں ان کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومتِ پاکستان نے تمغۂ امتیاز دیا ہے۔ ساہی وال کے مشاعرے میں، میں نے احسان صاحب کو اس پر مبارک پیش کی تو بولے۔ "میاں، مبارک چھوڑو ایک حکایت سنو۔ کسی بادشاہ نے ایک دن خوش ہو کر اپنے حجام کو سند دی کہ تم حجامت اچھی بناتے ہو۔ حجام خوشی سے پھولا گھر آیا اور کمرے میں اُلٹ بازیاں لگانے لگا۔ اس کی والدہ نے اس کی حالت غیر دیکھی تو وجہ دریافت کی۔ حجام نے بتایا کہ بادشاہ نے اسے حجامت میں ماہر قرار دیا ہے۔ یہ سُن کر والدہ نے کہا۔ "ارے بے وقوف! اس ضمن میں اپنے آپ کو ماہر اس روز سمجھنا جب اس فن کے ماہر تمہاری مہارت کے معترف ہوں۔" سو میاں ہم تو خود کو اس روز سند کے اہل پائیں گے جب ہماری برادری کے لوگ بھی ہمیں اس کا اہل سمجھیں گے۔"

(تمغۂ امتیاز۔ از: عطا الحق قاسمی)

"پنجاب والے جتنا دھیان اپنی صحت کا رکھتے ہیں کاش اتنا ہی اپنی زبان کی صحت کا بھی رکھیں اور یوپی والے جتنا دھیان زبان کی صحت کا رکھتے ہیں کاش اتنا اپنی صحت کا بھی رکھیں۔"

(ابنِ انشاء)

طنز و مزاح اپنی اشاعت کے لیے روزناموں اور ہفت ناموں میں تو جگہ پاتی ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ اردو کے سنجیدہ ادبی جرائد میں بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ سیاسی مسائل کی سنگینی یا بوریت اور ادبی موضوعات کی بے پناہ سنجیدگی سے تھوڑی سی راحت دینے کا ان مضامین سے کام لیا جاتا ہے، بلکہ اس لیے کہ اس صنف کی اردو ادب میں ایک باقاعدہ حیثیت عرصۂ دراز سے تسلیم کی جاچکی ہے جو پڑھنے والوں کو ایک بامقصد طنز اور خوشگواری اسی طرح فراہم کرتی ہے جس طرح کہ دوسرے فنونِ لطیفہ۔

فکاہیہ کالم نگاری کے میدان میں پاکستانی ادیب ہندوستانی ادیبوں پر ایک نمایاں سبقت رکھتے ہیں۔ آزادی کے بعد کئی اہم سنجیدہ ادیبوں و شاعروں نے بھی اس طرف خاص توجہ کی ہے۔ ان میں احمد ندیم قاسمی، جمیل الدین عالی، انتظار حسین

عطا الحق قاسمی، اظہر جاوید، گلزار وفا چوہدری وغیرہ بے شمار نام آتے ہیں جو ہر روز سماجی، سیاسی اور ادبی مسائل پر مختلف روزناموں میں لکھتے رہتے ہیں۔ وہاں کے قریب قریب سارے ہی اردو روزناموں کی مقبولیت انھیں کالموں کی وجہ سے بڑھی ہے۔ ہندوستان میں اعلیٰ پایہ کی طنزیہ و مزاحیہ کالم نگاری کی مثالیں دو ایک روزناموں ہی میں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر احمد جمال پاشائے "قومی آواز" میں "گلوریاں" کے ایک مستقل کالم میں حصہ لیا لیکن بہت زیادہ نہیں۔ ان کے زیادہ تر مضامین ادبی رسائل میں ہی چھپے۔ جب کہ فکر تونسوی نے اس صنف کو حیرت ناک حد تک مقبول بنایا اور دہلی کے روزنامہ "ملاپ" کی اشاعت میں بھی اضافے کا موجب بنے۔ "پیاز کے چھلکے" کالم لکھنے کی بدولت طنزیہ ادب میں فکر تونسوی زندہ جاوید ہو چکے ہیں۔ ان کے علاوہ مجتبیٰ حسین، بھارت چند کھنہ، وجاہت علی سندیلوی، یوسف ناظم وغیرہ کو جو شہرت ملی ہے وہ ادبی رسائل میں لکھنے کی وجہ سے ہے۔ دلیپ سنگھ اس سلسلے کا نیا نام ہے جو عوام سے ٹیلی ویژن کے ذریعے متعارف ہوئے ہیں۔

طنز و مزاح کی یہ کیفیت صرف مضامین، شاعری، ڈراما یا کالم نگاری تک ہی محدود نہیں ہے۔ بعض اہلِ قلم نے جن میں کچھ سنجیدہ شخصیات بھی شامل ہیں ذاتی خطوط میں بھی اس کا اظہار بے ساختہ کیا ہے۔ چنانچہ غالب اور مولانا ابوالکلام آزاد کے چھپے ہوئے مکاتیب سے اس کی مثالیں لی جا سکتی ہیں۔

میرے نام جن مشاہیر کے وقتاً فوقتاً خط آتے رہے ان میں سے کچھ ایک کے اقتباسات پیش کرتا ہوں :-

عبدالماجد دریابادی (۱۶ر جنوری ۱۹۶۳ء)

"آپ نے اتنا شاعرانہ خط لکھ کر مجھے شرمندہ کیا۔ میں سخت ملاقات چور، بلکہ کہنا چاہیے کہ آدم بیزار ہوں۔ ملاقاتیوں، مخلصوں، قدردافزاؤں کی کثرت سے عاجز آگیا ہوں۔ سیاسی، مذہبی، ادبی، ہر قسم کے پبلک جلسوں میں سالہا سال سے شرکت تک ترک کر رکھی ہے۔ (تقریر، صدارت وغیرہ کا کیا ذکر ہے) خط پر خط، تار پر تار آتے ہیں تو آیا کریں۔ ایک سن تھا جب نئی ملاقاتوں کا دل آرزومند رہتا تھا اب اس کے برعکس یہ دل بے لگی ہے کہ جاننے والے ہی بھول جائیں۔ ٹیگور نے ماڈرن ریویو میں ایک مضمون لکھا تھا THE PENALTIES OF BEING KNOWN بس وہی اپنے پر گزر رہی ہے ....."

آگے اُس ملاقات کے تاثرات کا ذکر ہے جو انھوں نے میرے غریب خانہ پر آکر فرمائی تھی۔ اس خط کی شانِ نزول یہ ہے کہ ان کی تشریف آوری کے بعد میں نے بھی دریابادجا کر ان سے ملاقات کرنے کی اجازت چاہی تھی لیکن جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہے وہ صاف کنی کترا گئے۔

کرشن چندر (۱۶ر نومبر ۱۹۶۸ء)

"....عرصۂ دراز کے بعد تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ اس لیے کہ اب خود سے خط لکھنے اور

ہلکے پھلکے مضامین (جن سے دل و دماغ پر بار نہ پڑے) یا ترجمے کرنے کی فی الحال اجازت مل گئی ہے اس لیے اب مصنّف سے مترجم ہونا پڑے گا۔ ترقّی معکوس اسے کہتے ہیں شاید"

راجہ مہدی علی خاں (۲۶ مارچ ۱۹۶۵ء)

"۔۔۔۔ میرے ایک حریف کا نام ہے وزیر آغا، دوسرے دشمن کا نام ہے رام لعل ایم اے یہ ہندو مسلم اتحاد کہیں مجھ کو میرے فن سمیت ختم نہ کر ڈالے خدا کرے تم دونوں کو ۔۔۔۔ عورتیں اٹھا کر پہاڑوں میں لے جائیں۔ آمین۔ تمہیں قسم ہے بجرنگ بلی کی۔ میرا یہ فقرہ بھابی کو مت سنانا۔ منٹو مرحوم نے ایک مرتبہ خطوط نویسی کے میدان میں مجھ سے ہاتھا پائی کی تھی۔ میں نے ایسی پٹخنی دی کہ وہ رونے لگے۔ آج تم دونوں "پہلوان" رانوں پر تھاپ دے دے کر مجھے مقابلے کی دعوت دے رہے ہو۔ خدا کے لیے باز آجاؤ۔ کیوں میرے پیٹ پر لاتیں مارتے ہو؟ موٹے آدمی کے پیٹ کا معاملہ تو اور بھی نازک ہوتا ہے جیسے سیدھے سادے بُرے بُرے خط لکھا کرتے تھے اب بھی لکھا کرو نا یار! ۔۔۔۔"

کنہیا لال کپور ... ناصر تونسوی (۱۸ اپریل ۱۹۷۰ء)

"۔۔۔ پیارے ہم نام، میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اگر ہمیں ایک دوسرے سے عشق ہے تو ہم ایک دوسرے کو پریم پتر کیوں نہیں لکھتے؟ چناں چہ یہ پہلا پریم پتر اس "بورنگ مناٹنی" کو توڑنے کے لیے لکھ رہا ہوں۔ اگرچہ آغاز کچھ دو بزنس لائیک سا ہے لیکن عشق کے لیے کوئی نہ کوئی بہانا تو پیدا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ۔۔۔۔"

طنز یا مزاح ایک شعوری کوشش سے کہیں زیادہ ایک لاشعوری جذبے کا نام ہے۔ جس طرح پہاڑوں کے سنگین دامن سے کوئی ٹھنڈا چشمہ اچانک پھوٹ پڑتا ہے، اسی طرح انسان کی فطرت سے بھی اس کا اظہار اچانک اور بے ساختہ ہو جاتا ہے۔ کسی کی افتادِ طبع کا بھی مرہونِ منّت ہوتا ہے تو اسے بھی انسانی فطرت کے اتفاقیہ تقاضے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ بہت سے لوگ ادیب یا شاعر نہیں ہوتے لیکن ان کی طبع ظرافت اور بذلہ سنجی انھیں ہر کہیں جانِ محفل بنائے رکھتی ہے۔ تلخی صرف ایسے پیدا ہوتی ہے جہاں "SENSE OF HUMOUR" کی کمی ہوتی ہے۔ یا جب کوئی شخص اپنی کمزوری کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ انسان اضداد کا مجموعہ (BUNDLE OF CONTRADICTIONS) ہے۔ ان تضادات کے باوجود بیشتر لوگ خوش رہنا پسند کرتے ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ لطیفے گھڑتے ہیں اور دوسروں سے بھی لطیفے سننے کے متمنی رہتے ہیں۔ وہ دوسروں پر طنز کرتے ہیں اور دوسروں کے طنز سہتے بھی ہیں۔ آخر میں اتنا کہوں گا کہ ہماری زندگی اور ہمارے ادب میں اگر طنز و مزاح اور ہنسی اور ٹھٹھوں کا وجود نہ ہوتا تو ہمارا جینا بہت بور ہوتا! شاید اب تک ہم ایک دوسرے کا گلا گھونٹ کر نسلِ انسانی کا ہی خاتمہ کر چکے ہوتے۔ اسی لیے میں شیریں بیانی ہمدردی محبت اور مسکراہٹ جیسی نعمتوں میں جو بنی نوع انسان کے لیے آبِ حیات کا درجہ رکھتی ہیں، طنز و مزاح کو بھی ایک مثبت قدر قرار دیتا ہوں۔

ڈاکٹر انور سدید

کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ

آج کتابوں کی اس مجلس میں میری ملاقات سب سے پہلے ساحل احمد سے ہوئی۔ انھوں نے مجھے بھارت کے شہر الہ آباد سے محمد حسین آزاد حکیم مومن خاں مومن اور فانی بدایونی کے بارے میں اپنی مرتبہ تین کتابیں تحفتہً عنایت کی تھیں۔ ساحل احمد اردو ادب کی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جن کا خمیر ایثار پیشگی سے اٹھایا گیا ہے۔ وہ خود ایک اچھے تخلیق کار ہیں اور چھوٹی بحروں میں غزل کے بڑے بڑے تجربات کرنے کے علاوہ انھوں نے ہائیکو کا مزاج اردو شاعری میں شامل کرنے اور جذبے کی گہرائی کا مختصر ترین نظموں میں پیش کرنے کی کاوش بھی کی ہے۔ "غزل۔ پس منظر اور پیش منظر" سے وہ ایک نقاد کی حیثیت میں متعارف ہوئے تھے۔ اردو زبان و ادب کی خدمت کا شوق فراوانی حاصل کر گیا تو انھوں نے اردو رائٹرز گلڈ کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا۔ اور "بغیر نفع اور بغیر نقصان" کے تصور کو پیشِ نظر رکھ کے ایسی کتابوں کی اشاعت شروع کی جنھیں منافع پسند ناشرین چھاپنے پر آمادہ نہیں ہوتے، میں انھیں دوسرا نول کشور شمار کرتا ہوں لیکن اب مکتبۂ اسلوب کے ذریعے مشفق خواجہ صاحب کا ادارہ سامنے آیا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ پاکستان میں خالص ادبی کتب کو زیورِ اشاعت سے آراستہ کرنے کا جو کام مشفق خواجہ سرانجام دے رہے ہیں وہی کام ہندوستان میں ساحل احمد نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ ہرچند یہ زیاں کا کاروبار ہے لیکن وہ اسے ادبی عبادت سمجھ کر سرانجام دے رہے ہیں اور ان کا یہ عمل ہندوستانی ادیبوں تک ہی محدود نہیں بلکہ انھوں نے ڈاکٹر وزیر آغا، رشید امجد، ہادی حسن، جمیلہ ہاشمی، مرزا حامد بیگ اور متعدد دوسرے پاکستانی مصنفین کی کتابیں چھاپ کے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اچھے ادب کی پیش کش میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ تعارفی نوعیت کی ان چند سطور کی ضرورت میں نے اس لیے محسوس کی کہ ساحل احمد ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی خدمت میں پیش پیش ہیں۔ لیکن ان کے گراں قدر کام کی پذیرائی مناسب طور پر نہیں ہوئی، خدا کرے کہ ان کا یہ سلسلۂ شوق جاری رہے اور مرحلۂ شوق کبھی طے نہ ہو۔ اس اجمال کے بعد اب آئیے ان کے ادارے کی تین نئی تالیفات کی طرف جو حال ہی میں پاکستان میں پہنچی ہیں۔

"محمد حسین آزاد" — مرتبہ: ساحل احمد

یہ کتاب محمد حسین آزاد پر مختلف مصنفین کے دس مضامین کا مجموعہ ہے۔ ساحل احمد نے ان مضامین کا انتخاب آزاد کے تخلیقی ذہن، تحلیقی مزاج، تنقیدی بیان اور شعری فکر کو مدِنظر رکھ کر کیا ہے اور لکھنے والوں میں پنڈت کیفی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وزیر آغا، محمد حسن عسکری، مرزا احمد منور، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، مسیح الزماں، ظہیر، ڈاکٹر مجتبیٰ حسین شامل ہیں۔

کو یا مضامین کے انتخاب میں موضوعی تنوع کو ہی پیشِ نظر نہیں رکھا گیا بلکہ فکر و نظر کے مختلف زاویوں کو بھی نمائندگی دی گئی ہے۔
پنڈت کیفی کا مقالہ درحقیقت ان کے جذبات کا تخلیقی مرقع ہے۔ اور آزاد کے فن اور شخصیت کی ان قدروں کو آشکار کرتا ہے جن سے کیفی صاحب کی اپنی زندگی بھی عبارت تھی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے آزاد کی انشا پردازی سے ان کی لفظ شناسی کی خصوصیات دریافت کی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے آزاد کے اسلوب سے تحرک کے آثار تلاش کیے اور واضح کیا کہ ان کا اسلوب آزاد کے اسلوبِ حیات سے متاثر تھا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ان کی ذہنی کیفیت کو ان کے عالمِ دیوانگی کے حوالے سے مطالعہ کرنے کی کاوش کی ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے آزاد کی تخلیقیت کو، اور مجتبیٰ حسین نے "آبِ حیات" کے بارے میں گفتگو رقم کرائی ہے۔ ساحل احمد کے پیسِ لفظ کو حیاتِ آزاد کا اجمال سمجھیے اور اس میں احوال و آثار کے ساتھ ان کی سب کتابوں کا تعارف بھی شامل ہے۔ یہ سب مضامین کتابوں اور رسالوں میں بکھرے ہوئے تھے، ساحل احمد نے انھیں یکجا کر کے محمد حسین آزاد کے بارے میں ایک دل فریب لفظی مرقع مرتب کرنے کی کاوش کی ہے۔ مجھے حیرت ہے تو صرف یہ کہ اس کتاب میں مولانا صلاح الدین احمد کا کوئی مقالہ شامل نہیں کیا گیا۔ مولانا صلاح الدین احمد آزاد کے مداح ہی نہیں تھے بلکہ ان کے اسلوبِ نگارش کے ادبی وارث بھی تھے۔

فانی بدایونی ــــ مرتبہ: ساحل احمد

فانی بدایونی پر مضامین کی ایک پوری کتاب مرتب کرنے کا خیال ساحل احمد کو یوں آیا کہ ایک طویل عرصے سے فانی کو قنوطیت زدہ اور سماجی تفکر سے عاری شاعر ثابت کرنے کا جذبہ پروان چڑھ رہا تھا۔ فانی کی کردار کشی کی کئی صورتیں بھی منظرِ عام پر آچکی تھیں۔ فانی کے بارے میں عصری گمرہی، اب آہستہ آہستہ بیٹھ چکی ہے اور وقت ان کا منصف بن چکا ہے۔ چناں چہ ساحل احمد نے فانی کے فن اور شخصیت کے بارے میں منصفانہ رائے قائم کرنے کے لیے وہ مضامین جن سے ادبی دنیا میں ایک تلاطم بپا ہو گیا تھا، جمع کر کے زیرِ نظر مجموعہ شائع کر دیا ہے۔

اس کتاب میں فانی کی زندگی کے آثار و احوال اعجاز صدیقی، سیماب اکبرآبادی، مختار سبزواری اور شاد اٹاوی نے لکھے ہیں ایک باب میں ڈاکٹر مغنی تبسم کی فانی کے بارے میں تحقیق کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مطالعۂ فن کے سلسلے میں مجنوں گورکھپوری، حامد حسن قادری، آلِ احمد سرور، حامدی کاشمیری، صبا متھراوی، الم مظفر نگری اور ماہر القادری کے ملاقات شامل ہیں۔ کتاب کا ایک اہم اور دل چسپ مقالہ رشید احمد صدیقی کا ہے جس میں انھوں نے غالب اور فانی کے فن کا موازنہ کیا ہے۔ اور بحث کے اجمال میں دونوں کے ہم معنی اشعار پیش کیے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں — غالب

تجلیاتِ وہم ہیں مشاہداتِ آب و گل — کرشمۂ حیات ہے خیال، وہ بھی خواب کا — فانی

غالب اور فانی کے بارے میں کلیم الدین احمد کی یہ رائے بھی توجہ کھینچتی ہے کہ "غالب کی دنیا وسیع، فانی کی دنیا تنگ، ان کے اسالیب کی دل کشی ان کی تنگ دامانی کو نہیں چھپا سکتی۔" یہ کتاب فانی کے بارے میں تائید، تردید اور تجدید کا منظر نامہ مرتب کرتی ہے اور ایسے مباحث کو تازگی عطا کرتی ہے جن میں ناقدین تو آپس میں دست و گریبان ہیں لیکن سامنے فانی کھڑے ہیں

اور کہہ رہے ہیں۔ " زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا "

مطالعۂ مومن ـــــ مرتبہ : ساحل احمد

مومن کی شاعرانہ عظمت اس حقیقت سے آشکار ہوتی ہے کہ محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" کی پہلی اشاعت میں انھیں جگہ نہیں دی تھی۔ لیکن جب آزاد اعتراضات کی زد میں آگئے تو انھوں نے مجبوراً ان کا تذکرہ "آبِ حیات" کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کر لیا۔ غالب نے ان کے اشعار کی داد، دل کھول کر دی۔ "گلشنِ بے خار" میں شیفتہ کی تعریف و تحسین کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ "نگار" کا مومن نمبر شائع ہوا تو نیاز فتح پوری کا یہ قول ضرب المثل بن گیا۔

" اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعرائے متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ مجھے کلیاتِ مومن دیدو اور باقی سب اٹھالے جاؤ۔"

ساحل احمد کی مرتبہ کتاب "مطالعۂ مومن" ہمارے سامنے اس عشق پیشہ شاعر کے فکر و فن کے متعدد گوشے لاتی ہے۔ امتیاز احمد نے مومن کے حالاتِ حیات آزاد کی کتاب "آبِ حیات" سے اخذ کیے ہیں۔ نیاز فتح پوری، اثر لکھنوی اور نور الحسن ہاشمی نے مومن کے رنگِ تغزل کی انفرادیت دریافت کی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مومن کی رباعی پر اور نور احمد الدنی نے مومن کی مثنوی نگاری پر مضامین پیش کیے ہیں۔ تنقید کا جدید نقش: صلاح الدین ندیم کے مقالے سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی (مومن کی شاعری میں کش مکش) ضیا احمد بدایونی (مومن کی طنزیہ شاعری) نیاز فتح پوری (مومن کے قصائد) نے بھی اس کتاب میں شرکت کی ہے۔ چناں چہ اگر اس کتاب کو مطالعۂ مومن کی ایک اہم کتاب قرار دیا جائے تو یہ بالکل درست ہوگا۔

"ابن الوقت ـــ ایک مطالعہ" ـــ مناظر عاشق ہرگانوی

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے "تنقیدی دبستان"۔ "امتزاج" اور فنِ تنقید جیسی کتابیں پیش کر کے نہ صرف انتقادی ادب میں اضافہ کیا ہے بلکہ طلبہ کو تنقیدی اصطلاحات کی تفہیم میں بھی معاونت فراہم کی ہے۔ مولانا نذیر احمد کی کتاب "ابن الوقت" کا تنقیدی مطالعہ طلبہ کی پریشانیاں رفع کرنے کے لیے ہی لکھی گئی ہے اور اس میں ایسے تمام سوالات کا جواب فراہم کیا گیا ہے جو طلبہ کی دانش سے بلند ہوتے ہیں اور جنھیں درسی نقاد بالعموم حل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی تنقید میں منظر کے ساتھ پس منظر کو اہمیت دینے کا رجحان نمایاں ہے۔ اس کتاب میں بھی انھوں نے ابن الوقت کے علامتی کردار کے پس پردہ حقیقی کرداروں کو تلاش کرنے کی سعی کی ہے اور اس کاوش میں انھوں نے تاول کا فن اور تاول میں علامت نگاری سے استفادہ کے عمل کو بھی بطورِ خاص اہمیت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب سے نہ صرف طلبہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں بلکہ یہ کتاب اساتذہ کی راہ نمائی بھی کر سکتی ہے۔

تحقیقات و تاثرات ـــ پروفیسر اکبر رحمانی

یوں تو پروفیسر اکبر رحمانی صاحب نے اس حقیقت پر تفاخر کا اظہار کیا ہے کہ ان کے مضامین پاکستان و ہند ادبی رسائل میں گزشتہ ۲۵ برس سے چھپ رہے ہیں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ ان کے نام اور کام سے اہلِ پاکستان کچھ زیادہ واقف نہیں۔ میرا ان سے پہلا تعارف زیرِ نظر

کتاب "تحقیقات و تاثرات" سے ہوا ہے جو اقبال، ٹیگور اور لمعہ حیدر آبادی کے خصوصی مطالعے اور ان نابغہ حضرات کے بارے میں تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اقبال اور ٹیگور کو تو ادب میں جاودانی حیثیت حاصل ہے لیکن لمعہ حیدر آبادی کا نام اب ہمارے ذہنوں میں ایک محب اقبال کی حیثیت میں ہی زندہ ہے۔ اکبر رحمانی صاحب نے لمعہ صاحب کو اقبال اور ٹیگور کے حوالے سے ہی اہمیت دی ہے۔ اور ان مراسم کا سراغ لگایا ہے جو لمعہ صاحب کو اقبال سے حاصل تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے شیخ عطاء اللہ اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی مرتب کردہ مکاتیب اقبال کی کتابوں سے بھی گراں قدر استفادہ کیا ہے۔ اس نادر موضوع میں اکبر رحمانی صاحب نے جو دل چسپی لی ہے۔ درحقیقت اس سے ہی مجھے خود ان میں دل چسپی پیدا ہوئی۔ میں ڈاکٹر عصمت جاوید کا ممنون ہوں کہ انھوں نے پیش لفظ میں اکبر رحمانی کا تعارف کرا دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ :

"اکبر رحمانی پکے خاندیس ہیں، صاف گو اتنے کہ جنھیں ان کی صاف گوئی کھلتی ہے وہ انھیں منہ پھٹ سمجھتے ہیں۔ زندہ دل، یار باش، سارے جہاں کا درد اپنے دل میں رکھنے والے۔ "آموز گار" ان کا ماہانہ رسالہ ہے جو مہاراشٹر میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی اور تعلیم و تدریس کے مسائل میں دل چسپی لیتا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں چلتی ہوئی تازہ ترین فہرست کتب بلکہ کتاب نما ہیں"

زیر نظر کتاب کا مزاج تحقیقی ہے۔ احتشام حسین اور پریم چند کے بارے میں انھوں نے اپنی تحقیق کا جوہر ہی پیش نہیں کیا بلکہ ان کی افسانہ نگاری پر تنقیدی اور تجزیاتی نظر بھی ڈالی ہے۔ شخصی زاویے سے انھوں نے مولوی عبدالحق کی سیرت کے نقوش تلاش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس سب کے باوجود اس کتاب کی اہمیت "اقبالیات" کے ضمن میں لمعہ حیدر آبادی کے بارے میں مضامین سے قائم ہوئی ہے۔ ان مضامین کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اقبال، ٹیگور اور لمعہ حیدر آبادی۔ ۲۔ اقبال سے لمعہ حیدر آبادی کے مراسم

۳۔ لمعہ حیدر آبادی کے نام اقبال کے خطوط۔ ۴۔ اقبال اور لمعہ حیدر آبادی کے شخصی تعلقات کا جائزہ۔

اکبر رحمانی صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات ہے لیکن اب وہ مجھے بے حد قدیم ادب آشنا اور اردو دوست نظر آنے لگے ہیں اور میں ان کی طرف افتخار سے دیکھ رہا ہوں۔

فرار ــــ ظفر پیامی

آخر میں ایک ناول جو اردو کے مقبول عام ناولوں سے مختلف ہے۔ یہ ناول ظفر پیامی نے "فرار" کے نام سے لکھا ہے اور اس میں سیاست کے آئینے سے کرداروں کی منافقتیں آشکار کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ اس ناول کے واقعات غیر معمولی طور پر حقیقی محلوم ہوتے ہیں اور کرداروں کے عقب میں بعض اہم تاریخی شخصیات کے چہرے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ زمانی اعتبار سے "فرار" ۱۹۷۲ء کے قرب و جوار کے عہد کو احاطۂ فن میں لیتا ہے، اس عرصے میں برصغیر کے سیاسی افق پر جو جاں کاہ واقعات ہو چکے ہیں ان کی تلخی ابھی ہمارے ذہنوں سے زائل نہیں ہوئی اور ان کا زہر ہمارے دلوں میں گہرا پٹا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ناول پڑھتے ہوئے واقعات ہماری آنکھوں کے سامنے متحرک ہو جاتے ہیں اور کردار ان شاطروں کا روپ اختیار کر لیتے ہیں جنھوں نے اس دور میں تاریخ کا چہرہ مسخ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

ظفر پیامی کا اصرار ہے کہ اس ناول کا کوئی کردار بھی حقیقی نہیں اور انھوں نے سچّا واقعہ اخبار میں بیان کرنے کی بجائے یہ ناول لکھا ہے تو اسے محض روداد نہیں بنایا بلکہ اسے واردات قلب بنانے کی سعی کی ہے۔ یہ ناول برّصغیر کے چند بڑے شہر ڈھاکہ، دہلی، لاہور، الہ آباد، کراچی اور کھٹمنڈو وغیرہ کے تناظر میں ایک ایسے کردار کی کہانی پیش کرتا ہے جو منزل منزل بھٹک رہا ہے لیکن اپنی حقیقی شناخت سے محروم ہے۔ یہ مادہ پرست اور بے ضمیر انسان ہے جس کے دل پر خوف مسلّط ہے اور اب ہر شہر اور ہر ملک میں جائے پناہ تلاش کر رہا ہے اور آخر میں جب اس کا لوبھی من اپنی کایا پلٹتا ہے تو اپنی زمین سے رشتہ استوار کر لیتا ہے۔

ظفر پیامی کو یہ افتخار حاصل ہے کہ ایک نامور صحافی کی حیثیت میں انھیں برّصغیر کے رہنمایانِ سیاست کے چہرے اور باطن پڑھنے کا موقع ملتا رہا۔ انھوں نے برّصغیر کی تاریخ کے متذکرہ مخصوص دَور کو بھی بنتے اور بگڑتے دیکھا۔ انھوں نے دہلی، لاہور اور الہ آباد جیسے شہروں میں زندگی بسر کی۔ اور ان کوچوں کو اپنے دل میں اوراقِ مصوّر کی طرح محفوظ رکھا۔ ان سب چیزوں نے اس ناول کو حقیقی تناظر عطا کیا ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم ناول نہیں پڑھ رہے بلکہ ماضی قریب کے واقعات کی شہادت دے رہے ہیں۔ ظفر پیامی کا تجزیہ بے لاگ اور بڑی حد تک غیر جانبدارانہ ہے۔ اس ناول کے بطون میں طنز کا زہر موجود ہے اور یہ قاری کے دل میں بھی اترتا ہے۔ لیکن اس عمل میں ظفر پیامی نے اپنی انسان دوستی کو سلامت رکھا ہے اور اس ناول کے کینوس پر جو کردار بھی اُبھرا ہے، ظفر پیامی نے اسے حقیقی رنگوں میں ہی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں نے یہ ناول پڑھنا شروع کیا تو چند صفحات پڑھ کر رکھ دیا۔ مجھے اس کی بل کھاتی اور ڈولتی ہوئی نثر نے اپنی گرفت میں نہیں لیا تھا۔ لیکن اس رات جب ٹی وی نے کراچی صدر میں دھماکے کی خبر بہت تاخیر سے نشر کی تھی اور میری نیند اُڑ گئی تھی تو میں نے یہ ناول پڑھنا شروع کیا۔ اور ظفر پیامی نے جب اپنے ہی دوستوں سے ملاقات کرا دی تو میں ساری رات سو نہ سکا۔

ظفر پیامی قرۃ العین حیدر کے اسلوب سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ناول میں تاریخ کو سمونے کی کوشش نہیں کی بلکہ ناول کو حالاتِ حاضرہ کا مرقّع بنایا ہے۔ انھوں نے تہذیب کے وسیع تناظر کو سمیٹنے کے بجائے تاریخ کے چھوٹے سے پیریڈ کا احاطہ کیا ہے۔ اور یہ ناول حیران کن انداز میں کرداکسیلا تاثر پیدا کرتا ہے۔

اختر شیرانی اور جدید اردو ادب

ڈاکٹر یونس حسنی

صفحات: ۵۴۴ قیمت: ۲۵ روپے

انجمن ترقی اُردو پاکستان بابائے اردو روڈ، کراچی ۱

طاہر مسعود

یوسف ناظم سے ایک مکالمہ

تمہید

یہ طنز و مزاح کی صنف کی مقبولیت کا دور ہے۔ سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی لحاظ سے انتشار اور تشویش کے اس دور میں طنز و مزاح کے فن کی مقبولیت بظاہر تعجب خیز محسوس ہوتی ہے۔ لیکن دیکھا جائے تو ایسے ہی زمانے میں ہنسنے ہنسانے کی ضرورت کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ لوگ زندگی کی تلخیوں اور بوجھل پن سے فرار چاہتے ہیں اور ایسی تحریروں کو شوق سے پڑھتے ہیں جو انھیں سکون اور مسرت بخش سکے۔ شاید اسی لیے پاکستان اور بھارت ہر دو ممالک میں طنز و مزاح لکھنے والے عام پڑھنے والوں میں بے پناہ مقبول ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ ان کی کتابوں کے ایڈیشن اور تعدادِ اشاعت سے لگایا جا سکتا ہے۔

فی زمانہ طنز و مزاح نہ صرف لکھا جا رہا ہے بلکہ اب تو طنز و مزاح کانفرنسیں بھی باقاعدگی سے منعقد ہو رہی ہیں۔ کراچی میں ہونے والی ایسی ہی ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے ہندوستان کے معروف مزاح نگار تشریف لائے تھے جن میں یوسف ناظم بھی شامل تھے۔ اگر آپ نے یوسف ناظم کی کتابیں نہیں پڑھیں تو مزاح کے ایک مختلف ذائقے سے محروم رہے اور اگر آپ یوسف ناظم سے نہیں ملے تو پھر آپ نے ایک ایسے شخص کو کھو دیا جس سے ملاقات ہنسی، بے فکری اور گرم جوشی سے عبارت ہوتی ہے۔

وہ کراچی کی گرد و غبار سے اٹی ہوئی تھکن آلود شام تھی جب میں ناظم آباد کی ایک کوٹھی پر یوسف ناظم صاحب سے ملاقات کے لیے پہنچا۔ "آئیے، آئیے، میں آپ کا انتظار ہی کر رہا تھا۔" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر ہم کوٹھی کی اوپری منزل پر ایک کمرے میں بیٹھ گئے۔ پست قامت، چہرے پر چیچک کے ہلکے داغ، سفید بال، روشن آنکھیں اور ہنسنے ہنسانے میں نہایت فراخ دل ——— یہ تھے یوسف ناظم جو اپنی تحریروں میں جتنے شگفتہ مزاج ہیں، عام زندگی میں ان کی شگفتہ مزاجی اس سے کہیں سوا ہے۔ ان سے میری پہلی ملاقات مشفق خواجہ صاحب کے گھر ایک دعوت پر ہوئی تھی جہاں میں نے ان سے اپنی نیازمندی کا اظہار کرنا چاہا تو گرم جوشی سے ہاتھ دبا کر بولے: "تکلف سے کام نہ لیجیے ورنہ میں آپ سے زیادہ باتکلف واقع ہوا ہوں۔" بلاشبہ وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جن سے پہلی ملاقات پر برسوں پرانی ملاقات کا گمان گزرتا ہے۔ عمر کے ستر سٹھویں سال

میں بھی وہ مجھے ایک ایسے نیک نیت بچّے کی طرح دکھائی دیے جس میں شوخی اور شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ ہماری گفتگو نہایت رسمی انداز میں شروع ہوئی اور پھر غیر رسمی صورت اختیار کر گئی۔ پھر رات ہوگئی۔ یوسف ناظم صاحب کو کسی عزیز کے گھر دعوت پہ جانا تھا۔ میں نے اجازت طلب کی اور یہ سوچتا ہوا لوٹ آیا کہ اگر یوسف ناظم صاحب کا قیام مستقلاً کراچی میں ہوتا تو ایسی کتنی ہی شامیں ضائع ہونے سے بچ جاتیں۔

کوائف یوسف ناظم کا اصلی نام سیّد محمد یوسف ہے۔ شاعر ہونے کی وجہ سے ناظم تخلّص کیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۴ء میں ایم اے کیا۔ اسی زمانے میں بزمِ اقبال حیدرآباد کی جانب سے مقابلۂ مضمون نگاری میں حصّہ لیا اور اوّل انعام حاصل کیا۔ بعد ازاں طنز و مزاح لکھنا شروع کیا تو اب تک دس کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ان میں سے متعدد کتابوں کو ایوارڈ مل چکے ہیں۔ ۷۶ سالہ یوسف ناظم بچّوں کے لیے بھی چار کتابیں تصنیف کر چکے ہیں۔ ترجمے اور تالیفات اس کے علاوہ ہیں۔ ان کی کتابوں کی تفصیلات درج ذیل ہیں۔

(۱) کیف وکم (۲) فٹ نوٹ (۳) دیوار ہے (۴) زیرِ غور (۵) سائے ہمسائے (۶) فقط (۷) البتّہ (۸) ذکرِ خیر (۹) بالکلیات (۱۰) فی الحال۔

بچّوں کے لیے: (۱) پلک نہ مارو (۲) الف سے یے تک (۳) مرغی کی چار ٹانگیں (۴) گاندھی جی جنوبی افریقہ میں

ترجمہ: ارمغانِ سنسکرت (بھرتمری ہری کا منظوم ترجمہ)

تالیفات: (۱) وجد نمبر (کتاب نما) (۲) ہندوستانی مزاح نمبر (شگوفہ) (۳) گوشۂ مجتبیٰ حسین (کتاب نما)

تدیرِ طباعت: (۱) نوائے کبیر (۲) فی الفور (مضامین)

بات چیت

سوال: پاکستان آپ پہلی مرتبہ تشریف لائے ہیں۔ اس موقع پر آپ کے تاثرات؟

یوسف ناظم تاثرات کیا ہوں گے، محرومی کے تاثرات ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ یہاں "طنز و مزاح کانفرنس" میں کرنل محمد خاں، سیّد ضمیر جعفری اور محمد خالد اختر سے ملاقات ہوگی لیکن بدقسمتی سے کسی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میں اس محرومی کے احساس کے ساتھ واپس جاؤں گا۔ بہرکیف، یہ طنز و مزاح کانفرنس پاکستان کا پہلا قطرہ تھی۔ اس کے مفید نتائج برآمد ہوں گے۔ اور جو کمی اس کانفرنس میں رہ گئی ہے وہ آئندہ کی کانفرنس میں دور ہو جائے گی۔ مزاح نگاروں کو یہاں جو پذیرائی حاصل ہوئی اس کی مجھے بہت خوشی ہے۔

سوال: یہاں سے آپ کیسی یادیں لے کر واپس جا رہے ہیں؟

یوسف ناظم: میں ایک خوشگوار موسم کا تاثر لے کر جا رہا ہوں۔ اس شہر میں بے محابا ٹریفک ہے، شہری شعور بھی کم ہے، گاڑی چلانے والوں کو اپنی جان کی پروا نہیں ہے تو دوسروں کی جان کی پروا کیا ہوگی۔ لوگ ایک ہی طرح کا لباس پہنتے ہیں۔ ہم لباسی اچھی چیز ہے اس سے اسٹیٹس کا فرق مٹ جاتا ہے۔ ہندوستان میں تو آدمی لباس سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ یہاں لوگوں میں ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ راستہ پوچھیے تو کام چھوڑ کر رستہ بتاتے ہیں۔ یہاں کے

لوگوں کی عادتیں کھانے پینے کے معاملے میں ہم سے مختلف ہیں۔ ہم بھیل پوری کھاتے ہیں آپ حلوہ پوری کھاتے ہیں۔ یہاں زندگی اتنی تیز رفتار نہ ہے جتنی بمبئی میں ہے۔ لیکن یہاں لوگ سحر خیزی کے فائدے نہیں اٹھاتے۔

سوال : آپ ہندوستان کے ایک معتبر مزاح نگار ہیں۔ آپ کی جتنی کتابیں اور مضامین میری نظر سے گزرے ہیں ان میں میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ کے مزاحیہ مضامین کے موضوعات عام طور پر ادب، ادیب اور ادبی صورتِ حال سے متعلق ہوتے ہیں۔ اس کا کیا سبب ہے؟

یوسف ناظم : چوں کہ میرا حلقہ ادیبوں اور شاعروں پر مشتمل رہا ہے اور میرا مشاہدہ بھی انہی لوگوں کا ہے تو گویا میں ان موضوعات پر لکھ کر آئینہ دکھاتا ہوں۔ لیکن میں نے ان موضوعات پر اب تک دس پندرہ مضامین ہی لکھے ہیں۔ پھر یہ کہ ادب کی نئی نئی تحریکات سامنے آتی ہیں تو میں ان پر بھی لکھتا جاتا ہوں۔

سوال : آپ کے ذہن میں مزاح کا کیا تصور ہے؟

یوسف ناظم : میں مکالماتی مزاح کو کمزور مزاح سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ جب تک آپ مکالمات کا سہارا نہیں لیں گے، آگے نہیں بڑھ سکتے۔ میں واقعاتی مزاح کو مشکل سمجھتا ہوں۔ قصے کہانی کو مزاح کے طور پر پیش کرنا دشوار گزار کام ہے۔ اور ہر ایک کے بس کا نہیں۔ ہمارے ہاں یہ کام مرزا عظیم بیگ چغتائی کرتے تھے۔

مزاح کا تعلق خوش طبعی سے ہے۔ اس میں مزاح کا دخل زیادہ ہے۔ طنز میں تلخی سے زیادہ دانشمندی ہوتی ہے۔ طنز کے لیے مطالعہ، مشاہدہ، وژن ضروری ہے۔ جب کہ مزاح کے لیے صرف خوش طبعی کافی ہے۔

سوال : گویا مزاح، طنز کے مقابلے میں ادنیٰ درجے کی چیز ہے؟

یوسف ناظم : ادنیٰ نہیں، خداداد چیز ہوئی۔ منٹو کے طنز کو مزاحیہ طنز نہیں کہیں گے۔ ہمارے ہاں طنز کا مقصد صرف نشتر زنی نہیں ہے۔

سوال : طنز بہر حال مقصد سے وابستہ ہوتا ہے۔

یوسف ناظم : مزاح میں بھی مقصد کا پہلو نکلتا ہے۔ مثلاً ایک شخص آتا ہے، وہ کہتا ہے "میں بکری خریدنا چاہتا ہوں"۔ میں اسے جواب دیتا ہوں کہ لیکن میں بکری نہیں بیچنا چاہتا۔ وہ پوچھتا ہے "آپ بکری کیوں نہیں بیچنا چاہتے ہیں"۔ میں کہتا ہوں۔ "اس لیے کہ میرے پاس بکری نہیں ہے"۔ یہ مزاح ہے۔ لیکن فرض کیجیے اگر اسی سوال کے جواب میں، میں یہ کہتا کہ میں آپ جیسے نادہندہ شخص کو بکری نہیں بیچ سکتا کیوں کہ میرے پاس بکری نہیں ہے تو یہ طنز ہوتا۔

سوال : اردو میں قابلِ ذکر مزاح نگار گنتی کے ہیں۔ یہی پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، مشتاق احمد یوسفی، شفیق الرحمٰن، ابنِ انشا اور چند ایک مزید۔ ان مزاح نگاروں کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟

یوسف ناظم : آپ مرزا فرحت اللہ بیگ کا نام کیوں نہیں لیتے۔ ان کا قلم بہت تیز ہے۔ رشید احمد صدیقی کی مزاح نگاری کی شہرت کے پیچھے ان کی شخصیت کا پرتو زیادہ ہے۔ ورنہ ان کا کینوس محدود ہے۔ وہ مزاح کو LOCALISED کر دیتے ہیں۔ وہ اتنے خوش طبع نہیں تھے جتنا تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہاں وہ بڑے دانشور اور نقاد ضرور تھے۔

پطرس بخاری کے پاس اسپارک زیادہ ہے، وٹن زیادہ ہے۔ ان دونوں بزرگوں کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے کم لکھا ہے اور اپنے آپ کو دس پندرہ مزاحیہ مضامین کی حد تک محدود رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں پانچ صفحے لکھوں گا تو پانچ غلطیاں کروں گا۔ اور پچاس صفحے لکھوں گا تو پچاس غلطیاں کروں گا۔ میں ابنِ انشا کو بہت پسند کرتا ہوں۔ وہ آخری عمر تک نہیں تھکے۔ ایسا لگتا ہے وہ اپنے ساتھ بہت کچھ لے گئے۔ جب کہ فکر تونسوی، کنہیا لال کپور، رشید احمد صدیقی ان سب کے پاس مواد ختم ہو گیا تھا۔ رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی دونوں اردو کے بڑے انشا پرداز ہیں۔ اور کلیم الدین احمد نے لکھا ہے کہ مزاح نگار کے لیے انشا پرداز ہونا ضروری ہے۔

ہر دو حضرات اس شرط کو پورا کرتے ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اختصار مزاح کا حسن ہے اور وہ ابنِ انشا کے پاس ہے۔ قولِ محال کی صورت انشا کے پاس ملتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی صاحب اب جو کچھ لکھ رہے ہیں ان کی عمر، تجربے اور انشا پردازی کے ساتھ جو کچھ انھیں دینا چاہیے وہ انھوں نے نہیں دیا۔ ان کی کتاب "زرگزشت" یا "خاکم بدہن" (زیرِ طبع) کا میں نے مطالعہ کیا۔ ان میں "چراغ تلے" اور "خاکم بدہن" جیسی شوخی شگفتگی اور حسن نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ ان کی عمر کا تقاضا ہے۔ یہ غلط ہے۔ اکبر الہ آبادی نے اپنے سب سے اچھے شعر آخری عمر میں کہے تھے۔

سوال: آپ کے خیال میں اس کا کیا سبب ہے کہ بعض اوقات کم و بیش یکساں تخلیقی صلاحیت رکھنے والے دو مزاح نگاروں میں سے ایک جمود کا شکار ہو جاتا ہے اور دوسرے کی تحریر کی تازگی برقرار رہتی ہے۔ جیسا کہ آپ نے ابنِ انشا کے متعلق فرمایا کہ وہ آخر وقت تک تھکے نہیں تھے۔ جب کہ یوسفی صاحب کی تحریر جمود کا شکار ہو گئی ہے۔

یوسف ناظم: اس کی ایک ہی وجہ ہے — ملنسار اور مجلسی ہونا۔ رشید احمد صدیقی اور یوسفی صاحب کم آمیز شخصیات ہیں۔ جب کہ پطرس بخاری اور ابنِ انشا مجلسی آدمی ہیں۔

سوال: اس کا مطلب یہ ہوا کہ شخصیت کا کھلا ہونا ضروری ہے۔

یوسف ناظم: بہت ضروری ہے — مارک ٹوئن ادیب سے بڑا سیاح ہے۔ اس کا آدھے سے زیادہ مزاح سیاحت کی دین ہے۔ اردو شاعری میں اس کی مثال غالب ہے۔ جس نے جوا کھیلا، جیل خانہ گیا۔ اس کی شاعری اور خطوط پڑھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ہماری آپ کی طرح کا آدمی ہے۔

سوال: یہ تو لائف اسٹائل کی بات ہے — لیکن کیا یہ لائف اسٹائل شعوری کوشش سے بنانا پڑتا ہے؟

یوسف ناظم: یہ ریاض ہے — گویا آواز اچھی ملی ہے لیکن آپ نے اس آواز کی تربیت نہیں کی — دیکھیے میں بھارت سے کراچی آیا — یہاں آنے سے مجھے لکھنے کے لیے بہت سے موضوعات ملے جو ظاہر ہے گھر بیٹھے رہنے سے مجھے نہیں مل سکتے تھے۔

سوال: آپ تحریر پہ محنت کرنے کے کس حد تک قائل ہیں؟

یوسف ناظم: اس سے برجستگی ختم ہو جاتی ہے — جب آپ کوئی مضمون لکھ لیتے ہیں تو آپ اس پہ لاکھ نظرِ ثانی کریں، بات آگے نہیں بڑھے گی، وہیں رہے گی۔

سوال : پاکستان و بھارت میں جس درجے کی مزاح نگاری ہو رہی ہے اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے ؟

یوسف ناظم : اب جب کہ موضوعات بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ معاشی، اقتصادی، سماجی مسائل پیچیدہ صورت اختیار کر چکے ہیں۔ افسوس کہ ان پر مزاح نگار نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ کالم نگار لکھ رہے ہیں۔

سوال : کیا یہ صحیح ہے کہ بھارت میں اردو کالم نگاری دم توڑ رہی ہے ؟

یوسف ناظم : جی ہاں ——— مزاحیہ کالم نگاری تو اب پاکستان ہی میں رہ گئی ہے۔ ایک اور بات بھی ہے۔ پہلے ادیب صحافت میں آتے تھے۔ اب صحافی ادب میں آ رہے ہیں۔ مولانا آزاد، ظفر علی خان، عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت یہ سب بڑے ادیب تھے جو صحافت میں آئے تھے ——— بنیادی طور پر ایک کالم نگار کے لیے ادیب ہونا ضروری ہے۔ "اودھ پنچ" میں لکھنے والے سب کے سب ادیب تھے۔ کیوں کہ جب ادیب کالم نگاری کرتے ہیں تو ان کے کالموں میں ادب کی چاشنی ہوتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ صحافی ادیب نہیں بن سکتا۔ صحافی پر ادب کے دروازے بند نہیں ہیں لیکن اس کے لیے اسے مشق کرنی ہوگی۔

سوال : مزاح لکھنا مشکل کیوں ہے ؟

یوسف ناظم : اس میں اوریجنلٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سنجیدہ تحریر میں موضوع کا خاکہ سامنے ہوتا ہے۔ افسانے میں پلاٹ مل جاتا ہے۔ لیکن مزاح میں بات سے بات پیدا کرنی ہوتی ہے۔ کمزور شعر سنیں تو طبیعت منغّص نہیں ہوگی۔ لیکن کمزور مزاح سے طبیعت میں تکدّر پیدا ہو جاتا ہے۔

سوال : تنقیدی سطح پر مزاحیہ ادب کو دوسرے درجے کا ادب سمجھا جاتا ہے، اس رویّے کی آپ کیا توجیہہ کریں گے ؟

یوسف ناظم : میں مانتا ہوں کہ مزاحیہ ادب دوسرے درجے کا ادب ہے کیوں کہ پہلے درجے کا ادب لکھا ہی نہیں گیا ہے۔ کوئی صنف کبھی پہلے یا دوسرے درجے کی نہیں ہوتی اس لیے مزاحیہ مضامین تو دوسرے درجے کے ہو سکتے ہیں لیکن طنز و مزاح دوسرے درجے کی کیسے ہو سکتی ہے۔ ایسا اس لیے سمجھا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں دربار میں مسخروں کو رکھا جاتا تھا۔ جو ہنسنے ہنسانے کا کام کرتے تھے۔ انشاءاللہ خاں انشاؔ تک کو دربار میں رکھا گیا تھا تاکہ وہ لطیفے سنائیں حالاں کہ وہ اردو کے بہت بڑے آدمی ہیں۔

سوال : آج کے عہد میں جو بڑے بڑے مسائل ہیں طنز نگار ان مسائل کی طرف توجہ نہیں کرتے بلکہ خود ساختہ کرداروں کی مضحک حرکتوں کے بیان میں سارا زورِ قلم صرف کر دیتے ہیں۔

یوسف ناظم : آج کے ادیبوں کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی ہے۔ میں ایک اچھا مزاح لکھ سکتا ہوں۔ لیکن جب لکھتا ہوں تو کسی کی تعریف میں لکھتا ہوں۔ یعنی قدرت نے مجھے صلاحیت دی ہے لیکن میں اپنی مصلحت اندیشی اور کوتاہ بینی کی وجہ سے اس صلاحیت سے فائدہ نہیں اٹھا [illegible] مسئلہ آج کے بیشتر ادیبوں کے ساتھ ہے۔ اب جو نئے لکھنے والے سامنے آئے ہیں انھوں نے کلاسیکس کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ رشید احمد صدیقی صرف اپنی انشا پردازی کی وجہ سے جو مزاح پیدا کرتے تھے اب وہ مزاح میرا بچہ پیدا نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ اس نے کلاسیکی

ادب کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ نئے لکھنے والے زبان نہ جاننے کو عیب نہیں حسن سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ زبان بے معنی چیز ہے حالاں کہ مزاح لکھنے کے لیے زبان جاننا بہت ضروری ہے۔ ابنِ انشا کے مزاح کا حسن ان کے ایجاز و اختصار میں ہے اور یہ اختصار کا فن انھوں نے شاعری سے سیکھا۔ وہ شاعر تھے اس لیے دریا کو کوزے میں بند کرنا جانتے تھے۔

سوال: ایک تاثر یہ بھی ہے کہ مزاح نگار پڑھنے والوں پر سنجیدہ مقاصد کے لیے اثر انداز نہیں ہو سکتے؟

یوسف ناظم: انگریزی ادب میں یہ بات سولفٹ کی حد تک صحیح نہیں ہے لیکن مارک ٹوئن کی حد تک درست ہے۔ سولفٹ نے تو اپنی قوم کا مزاج بدل کر رکھ دیا۔ لوگ جو لباس پہنتے تھے، سولفٹ کی تحریروں کو پڑھ کر انھوں نے وہ لباس پہننا چھوڑ دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برطانیہ ایک چھوٹا ملک تھا۔ وہاں کمیونیکیشن زیادہ تھا۔ معیارِ تعلیم بلند تھا۔ ہمارا مزاح تو عوام تک پہنچ ہی نہیں پاتا۔ جو کچھ پہنچتا ہے وہ ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے۔

سوال: اکبر الہ آبادی کی شاعری تو پہنچ گئی۔ اور وہ بھی اس وقت جب انھیں ریڈیو اور ٹی وی میسّر نہیں تھے۔

یوسف ناظم: شاعری کا پہنچنا آسان ہے۔ لوگ مشاعرے میں جاتے ہیں اور شعر سن لیتے ہیں لیکن نثر کیسے سنیں۔ اسی لیے دیکھیں کہ غالب کی غزل کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جتنی ساحر کی نظموں کو۔ کیوں؟ اس لیے کہ پسند آگیا۔ اور میرا کلاسیکی شعر دھرا رہ گیا۔ لیکن اس سے طنز کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ طنز بہت جلدی آدمی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس لیے اکبر کی عشقیہ غزلیں دھری رہ گئیں اور ان کی ظریفانہ شاعری مقبول ہو گئی۔

سوال: انگریزی کا مزاحیہ ادب اردو میں بہت کم منتقل ہوا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ بیان کی جاتی ہے کہ شاعری کی طرح مزاح کا ترجمہ بھی ناممکن ہے۔ کیوں کہ ہر قوم کا اپنا تصورِ مزاح ہوتا ہے اور ہر مزاح اپنے کلچر اور فضا سے اتنا مربوط ہوتا ہے کہ اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

یوسف ناظم: مزاح میں اگر مقامی رنگ زیادہ ہو تو ترجمہ مزہ نہیں دیتا۔ مجھے انگریزی مزاح پسند آتا ہے لیکن میں مترجم نہیں ہوں۔ بہت اچھے مترجم ہوں گے لیکن ممکن ہے کہ ان میں ترجمے کا ذوق نہ ہو۔ کسی کہانی میں اگر صرف الفاظ کا مزاح ہو تو ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ لطیف مزاح کا ترجمہ آسان ہے لیکن لاؤڈ مزاح کا ترجمہ مشکل ہے۔ مثلاً وُوڈ ہاؤس کے مزاح کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ اسٹیفن لیکاک کا ترجمہ آسان ہے لیکن مزاح کمزور ہے۔ وُوڈ ہاؤس کے ایک ایک جملے میں کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے۔ مارک ٹوئن کے پاس اندرونیت کم ہے۔ اس نے خارج کی دنیا سے مزاح اخذ کیا ہے۔ اس کا مزاح ڈائرک روم سے نکلی ہوئی تصویر معلوم ہوتی ہے۔

رشید امجد

"لمحوں کی راکھ"

"لمحوں کی راکھ" میرزا ادیب کا ناول اور ان کی فنی تازگی کا ایک نیا شاہکار ہے۔ فکشن کی دنیا میں میرزا ادیب ایک منفرد تام ہے کہ ان کی کہانیاں اور ڈرامے اپنے سماجی اور تہذیبی سیاق سباق میں ایک بڑے منطقے کا احاطہ کرتے ہیں۔ "صحرائے نورد کے خطوط" سے "لمحوں کی راکھ" تک میرزا ادیب کا فنی سفر مسلسل ارتقا کے عمل سے گزر رہا ہے۔ اور "گلی گلی کہانیاں" کے بعد ان کا یہ تازہ کارنامہ ان تھک لگن کا ثمر ہے۔ اب میرزا صاحب اس مقام پر ہیں جہاں ان کے یہاں کلاسکی نقوش نمایاں ہو کر اپنی ایک پہچان بنا چکے ہیں۔ اور ان کی کہانی واقعات و کردار اور ماحول کا ایک مجموعہ ہی نہیں رہتی بلکہ اس سے آگے نکل کر اپنے عہد کے مزاج اور حادثات کی تاریخ بن گئی ہے۔ یہ کہانی ایک آئینہ خانہ ہے جس میں پورا عہد سانس لیتا محسوس ہوتا ہے۔

"لمحوں کی راکھ" فنی بُنت کاری، اسلوبی دیانت، کہانی کی دوہری پرت اور اپنے وسیع سماجی مشاہدے کی بنا پر ایک نمائندہ ناول ہے۔ اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ اس ناول کی بُنت بہت کمال کی ہے۔ کہانی کو اتنے سلیقے اور عمدگی سے ترتیب دیا گیا ہے کہ کہیں جھول کا احساس نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ ایک اچھے ناول میں داستان کا سا تحیّر اور فنی الجھاؤ ہوتا ہے۔ اس حوالے سے "لمحوں کی راکھ" اپنی ایک انفرادیت رکھتا ہے کہ اس کہانی میں شروع سے ایک اسرار اور تحیّر ہے اور لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ابتدا میں زبیر کا خان صاحب تک پہنچنا اور خان صاحب کے گھر کا پراسرار ماحول، بیوی کا رویّہ، پھر صبا کا وہاں آنا کہانی کو ایک موڑ دیتا ہے۔ کہانی کا دوسرا موڑ ثمریّا اور اس کے بیٹے سے شروع ہوتا ہے۔ جعفر شاہ کی موت کے بعد زبیر کا وہاں پہنچنا ایک نئے سلسلے کا آغاز بنتا ہے۔ لیکن درمیان میں سائیں جی کا کردار کہانی کو طبیعیاتی دنیا سے اُٹھا کر مابعد الطبیعیاتی فضا میں لے جاتا ہے۔ میرزا ادیب کے یہاں ایک اسرار شروع سے موجود رہا ہے جو رومانیت سے ان کے لگاؤ کا نتیجہ ہے۔ ان کی ابتدائی کہانیوں "صحرائے نورد کے خطوط" میں بھی یہ اسرار موجود ہے اور کہیں کردار اور کہیں فضا کی صورت میں کہانی کو دوہری معنویت سے آشنا کر دیتا ہے "لمحوں کی راکھ" میں سائیں اسی طرح کا کردار ہے۔ جو کہانی کو باطنی دنیا میں لے جاتا ہے۔ یہ کردار خان صاحب کا باطنی عکس نظر آتا ہے۔ اس کی دانائی اپنے پیچھے ایک وسیع مشاہدہ اور باطنی تجربے کی دنیا چھپائے ہوئے ہے۔ سائیں جی جس پُراسرار طریقے سے کہانی میں داخل ہوتا ہے اسی طرح نکل جاتا ہے۔ اس کا آخری مکالمہ بڑا معنی خیز ہے۔

سائیں نے پہلا گھونٹ بھر کر پیالہ رکھ دیا اور خان صاحب سے مخاطب ہو کر کہا ـــــــ "وہ ایک قصہ ہے حاتم طائی کا، پڑھا ہوگا آپ نے"۔

"پڑھا ہے، آرائشِ محفل نام ہے اس کتاب کا۔

"اس میں ایک کہانی ہے جس میں وہ کوہِ ندا سے ایک ندا آتی ہے۔ یہ کہانی یاد ہوگی آپ کو۔"

خان صاحب اور زبیر نے ہاں کے انداز میں سر ہلا دیئے۔

"دنیا میں ہر جگہ وہ کوہِ ندا ہے۔ کوئی بھی یہ نہیں جان سکتا کہ وہ کہاں ہے۔ اس کوہِ ندا سے ہر وقت ایک آواز آتی رہتی ہے کہ اے فلاں جتنا تجھے کھانا تھا کھا لیا ہے، جتنا پینا تھا پی لیا ہے، جو کچھ کرنا تھا کر لیا ہے۔"

سائیں دو تین لمحے چپ رہنے کے بعد بولا ـــــــ "یہ آواز کسی نہ کسی کو پکارتی رہتی ہے۔ دن کے اجالے میں، رات کے اندھیرے میں کوئی نہیں سنتا یہ آواز مگر جسے پکارا جاتا ہے وہ رک نہیں سکتا، چلا جاتا ہے۔"

دونوں کے پیالے ہونٹوں تک پہنچتے پہنچتے رک گئے تھے۔

"کون جانے کوہِ ندا کس کو پکار رہا ہے۔ ہو سکتا ہے یہیں ہم میں سے کسی کو پکار رہا ہو، کون جانتا ہے۔"

سائیں کا کردار اپنے اندر اسرار و رموز کی ایک وسیع دنیا چھپائے ہوئے ہے۔ اس دنیا میں داخل ہونے کے لیے ایک وقار اور تربیت کی ضرورت ہے۔ میرزا ادیب اپنے قاری کو بڑی خاموشی سے اس دنیا میں لے جاتے ہیں اور چند لمحوں کے لیے اصل کہانی کے کردار پس پشت چلے جاتے ہیں ـــ روحانیت کی یہ دنیا خان صاحب کی پناہ گاہ نہیں ہے بلکہ ان کی روح کی ایک طلب اور اس کا پھیلاؤ ہے۔ سائیں جس انداز سے کہانی میں داخل ہوتا ہے اسی طرح چپ چاپ مگر ایک گہرا، نہ مٹنے والے تاثر چھوڑ کر غائب ہو جاتا ہے۔

> "دونوں کے دلوں میں کوہِ ندا کی آواز کے احساس نے جو خوف، دہشت اور دور دراز کے اندیشوں کے سائے ابھار دیئے تھے، وہ طویل ہوتے جا رہے تھے۔ وہ سائیں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ سحر زدہ انسان کی طرح بولنا چاہتے تھے مگر تاب گویائی سے جیسے محروم ہو گئے تھے۔ چپ چاپ دیکھے جا رہے تھے، بس دیکھے جا رہے تھے۔ سائیں ستار تھامے اپنی جگہ سے اٹھا اور خان صاحب کے پاس آ کر بولا ـــــــ "خان صاحب سنبھالو اپنی امانت۔ میں نے رات کوہِ ندا کی آواز سن لی تھی۔ میں جا رہا ہوں۔ میں لال شہباز قلندر کی درگاہ میں جوتیاں صاف کرنے والا، میں جا رہا ہوں۔"
>
> سائیں نے ستار خان صاحب کی گود میں رکھ دی ـــ "خدا حافظ" مدھم سی آواز آئی۔
>
> اور پھر کوٹھری میں وہی دو تھے اور کوئی نہ تھا۔

روحانیت اور اسرار میرزا ادیب کا ایک قلبی مسئلہ ہے لیکن انھوں نے روحانیت یا مابعد الطبیعیات کو شعبدہ بازی کی سطح پر استعمال نہیں کیا بلکہ روحانیت اور مابعد الطبیعیات کے دانشورانہ پہلو کو محسوس کرانے کی کوشش

کی ہے۔ "صحرا نورد کے خطوط" سے "ساتواں چراغ" تک ان کی مختلف طویل اور مختصر کہانیوں میں کہیں کرداروں کے ذریعے اور کہیں ماحول کے ذریعے اس روحانی کیف کا سراغ ملتا ہے۔ میرزا ادیب اس روحانی کیف میں قاری کو شامل کر کے اسے عصر سے ماورائے عصر لذت سے آشنا کرتے ہیں۔ "لمحوں کی راکھ" میں سائیں کا مختصر کردار اور بچے تلے مکالمے دوسرے دونوں کرداروں کی باطنی کشمکش کو ایک مرکزی نقطے تک لے آتے ہیں اور بہت سی اَن کہی صورتِ حال لفظوں کے بغیر قاری تک پہنچ جاتی ہے۔

"لمحوں کی راکھ" کا ایک اور قابلِ ذکر پہلو اس کی ڈرامائی کیفیت ہے۔ میرزا ادیب افسانے اور ڈرامے پر یکساں وقت ماہرانہ گرفت رکھتے ہیں۔ اس ناول میں واقعات کا تانا بانا اس طرح بُنا گیا ہے کہ ہر بات ایک EPISODE بن جاتا ہے۔ آغاز میں زبیر کا ٹرین میں سفر کرنا ایک غیر متوقع صورتِ حال میں نیا موڑ کاٹتا ہے۔ ویران اسٹیشن پر خان صاحب سے ملاقات ایک مکمل EPISODE ہے۔ خان صاحب سے مل کر حویلی تک آنا اور حویلی کی پراسرار فضا سے گزر کر بجیبہ سے ملنا اور واپس جانے کا خیال ترک کر کے لوٹ آنا بھی ایک EPISODE ہے۔ پھر صبا کا کہانی میں داخل ہونا ـــــ بی بی کا آنا ـــــ راولپنڈی میں ثریّا اور اس کے بیٹے کا سلسلہ ـــــ نسیم کا آنا، حادثہ کا ہونا ـــــ یہ سب کڑیاں اپنی اپنی جگہ ایک مکمل باب اور مکمل اسکرپٹ ہیں جنھیں بہت آسانی سے ایک عمدہ طویل ڈرامے کی شکل دی جا سکتی ہے۔ درمیان میں سائیں کا قصّہ اس ڈرامہ کو سماجی صورتِ حال سے اُٹھا کر روحانی بلندیوں سے بھی ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ آج کل ہمارے ٹی وی پر جو طویل دورانیہ ڈرامے چل رہے ہیں ان میں جس طرح مغربی کلچر کو ہم پر مسلّط کیا جا رہا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر ڈراموں کے مرکزی خیال مغرب سے مستعار ہیں جنھیں بغیر اعلان کیے بے ڈھنگے طریقے سے مشرقی کلچر میں ڈھالا جا رہا ہے۔ "لمحوں کی راکھ" ہماری تہذیب سے جنم لیتا ایک اور بجنل آئیڈیا ہے جسے بہت عمدگی سے ڈرامے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس ناول کی ایک اضافی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک اسرار اور دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ ایک ایسی دلچسپی جو قاری کو ایک باب سے دوسرے باب میں داخل ہونے پر مجبور کر دیتی ہے اور اسے ختم کیے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ پھر یہ کہ ناول کا انجام بہت ہی عمدہ فنی طریقے سے ہوا ہے جس میں غیر متوقع صورتِ حال بھی ہے اور ایک مسلسل کسک بھی۔ یہ کہانی اپنے انجام پر پہنچ کر صبا اور نسیم کے حوالے سے ایک نئی کہانی کو جنم دیتی ہے۔ گویا یہ ناول اپنے اندر نئے ناول کا آغاز یہ بن جاتا ہے جو میرزا ادیب کی فنی پختگی اور عمدہ کہانی کار ہونے کی دلیل ہے۔ اچھے ناولوں کی صف میں "لمحوں کی راکھ" ایک عمدہ، معیاری اور قابلِ ذکر ناول کے طور پر اپنی پہچان کرائے گا۔

اسلوبیاتِ میر

مصنف: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

قیمت: ۲۰ روپے

انجمن ترقیِ اردو پاکستان بابائے اردو روڈ۔ کراچی ۱

گل ہائے رنگ رنگ

بنگلہ نظم

قاضی نذرالاسلام/ افسر ماہ پوری

میرے مانجھی لیے چل مدینے مجھے

میرے مانجھی لیے چل مدینے مجھے
میرا مرشد ہے تو اور مرا راہبر
میں ہوں اس راہ سے آج تک بے خبر
احمدِ مصطفیٰ رحمتِ دو جہاں
میرے مانجھی وہ سوئے ہوئے ہیں وہاں
اب نہ ہوگا جو دیدارِ روئے حسیں
جان بچ جائے میری یہ ممکن نہیں
ریگزاروں میں گر کوئی دریا نہیں
غم نہ کر اس سے رکتا ہے رستہ کہیں
اس قدر روؤں گا بہہ چلے گی ندی
راہ آسان ہو جائے گی ناؤ کی
اپنے چہرے پہ خاکِ مدینہ ملوں
اور اپنے محمدؐ کا کلمہ پڑھوں
میری آنکھیں ہوں اور آنسوؤں کی جھڑی
جیسے تھیں کربلا میں سکینہ کبھی
میرے مانجھی لیے چل مدینے مجھے

چیڈیوک ٹکبورن / یعقوب لطیف

ایک نظم

ٹکبورن (۱۵۵۸ء تا ۱۵۸۶ء) کی شہرت شاعر سے زیادہ سازشی یا انقلابی کی ہے۔ وہ اور اس کے والد، کٹر رومن کیتھولک تھے اور اپنے عقیدے کے فروغ کے لیے ہر حربہ کو جائز سمجھتے تھے۔

وہ انگلستان میں ساؤتھمپٹن کے مقام پہ غالباً ۱۵۵۸ء میں پیدا ہوا۔ اپریل ۱۵۸۶ء میں چیڈیوک سازشیوں کے ایک ٹولے میں شامل ہوگیا۔ جون میں ٹکبورن سمیت چھ افراد کو ملکہ الزبتھ کے قتل پہ مامور کیا گیا تاکہ برطانیہ کا الحاق مملکتِ روما کے ساتھ کیا جا سکے۔ شومیٔ قسمت سے حکومت سازش سے بروقت آگاہ ہوگئی اور تمام سازشی ملک سے فرار ہوگئے مگر ٹکبورن ٹانگ زخمی ہونے کے باعث لندن ہی میں روپوش ہوگیا۔

وہ ۱۴ اگست ۱۵۸۶ء کو گرفتار ہوا اور ۱۴ ستمبر کو اسے غداری کے مقدمے میں پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ ۲۰ ستمبر کو تقریباً ۲۹ سال کی عمر میں اس انقلابی کو پھانسی دی گئی۔ پھانسی سے قبل اذیت پہنچانے کی خاطر اس غریب کا شکم بیدردی سے چاک کیا گیا۔

اپنی زندگی کی آخری شام یعنی ۱۹ ستمبر ۱۵۸۶ء کو چیڈیوک نے اپنی بیوی ایگنس کے نام خط کے ساتھ تین بندوں پر مشتمل ایک نظم لکھ بھیجی جو ۱۶ ویں صدی کے انگریزی سرمایۂ شاعری میں سب سے زیادہ اثر انگیز سمجھی جاتی ہے۔ اپنی ذات کا یہ نوحہ انگریزی کے کلاسیکی شاہکاروں میں شمار ہوتا ہے۔

گدازِ عشق مانگے ہے جوانی
زمانے سے ملی ہے سرد مہری

میانِ موسمِ خوشبو و لالہ
غم و اندوہ سے ہے اپنا پیالہ

اسے کشتِ صدا شاداب کہیے
خس و خاشاک میں جو پل رہی ہے

یہ احسانِ نگارِ زیست کیسا
ملی ہے ناامیدی بے تحاشہ

کچھ ایسے قید میں دن کا گزرنا کہ سورج دیکھنے کو بھی ترسنا
ستم کا قہر کا پیغام بن کر
یہ ہستی رہ گئی الزام بن کر

مرا موقف سنا کیے کسی نے کہا کچھ بھی نہ جب اپنی زباں سے
ثمر سے عاری ہستی کا شجر ہے مگر پتّوں کی رنگت خوب تر ہے
جوانی لذّتِ پیری کو ترسے کہ یہ بارِ وجود اُترے ہے سر سے
نگاہوں میں سمایا گو جہاں ہے زمانہ مجھ سے لیکن بدگماں ہے
نہیں سانسوں کا یہ الجھاؤ بس کا تو کیسے قرض اُتاریں ہم نفس کا
ستم کا قہر کا پیغام بن کر
یہ ہستی رہ گئی الزام بن کر

متاعِ مرگ جس کی جستجو تھی وہ میری کوکھ ہی میں پل رہی تھی
تلاشِ زیست میں گھر سے چلا تھا کہ سائے کا تعاقب کر رہا تھا
سمجھتا تھا جسے میں ماں کا دامن وہ دھرتی اصل میں تھی میرا مدفن
شعوری آنکھ کل کھولی تھی میں نے اور اسرافیل سرہانے کھڑے تھے
انڈیل آج اتنی مے۔ ہم رنگ لالہ چھلک جائے مرا کم ظرف پیالہ
ستم کا قہر کا پیغام بن کر
یہ ہستی رہ گئی الزام بن کر

گلہائے رنگ رنگ

انگریزی نظم

اے۔ ایل خطیب / ادیب سہیل

بیٹے کی سالگرہ پر

سدھارتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
یشودھرا نے راہل کو کہا
"یہ تمہارے پتا ہیں ان سے تم وراثت طلب کرو"
بدھ نے راہل کو اپنا زعفرانی چُغہ دیا اور کہا
"یہ تمہارا ورثہ ہے"
"پتا ــــــ پتا"
ہاں میرے ننھے
میں جانتا ہوں ــــــ
میری خموشی تمہارے لیے تکلیف دہ ہے
تمہاری آنکھوں میں حیرانی ہے
تم ابھی کم سن ہو ــــــ اپنا دکھ بیان نہیں کر سکتے۔
تمہارے دل پر جو گزر رہی ہے
میں اسے محسوس کر سکتا ہوں
لیکن ہم سب بے بس ہیں۔
تم سے بات کرنے کی تڑپ مجھ میں شدید ہے۔

لیکن زبان چُپ ہے،
میں جانتا ہوں ــــــ
تمہارا کرب ناقابلِ برداشت ہے:
مجھے کچھ کچھ لگتا ہے۔
تمہاری ماں مسکراتی ہے!
لیکن وہ بھی تمہاری طرح دُکھی ہے۔
میں تمہیں اپنے سینے سے چمٹا کر
اپنی خموشی میں شریک کرنا چاہتا ہوں،
یہی تمہارا ورثہ ہے.
تم اِدھر دیکھو
خموشی کے تالاب میں
جہاں مُردہ الفاظ
درخت سے ٹوٹے ہوئے پتوں کی طرح رواں ہیں
اور تمہاری مسکراہٹ
کِھلتے ہوئے کنول کا عکس ہے۔

گلہائے رنگ رنگ

عربی کہانی

محمود درویش/قیصر سلیم

وہ شہری جن کا کوئی ملک نہیں

صبح چار بجے آپ کے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ آنے والا کون ہے۔ لیکن نیند پولیس سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔ آپ نو بجے کام پر جاتے ہیں۔ اخبار پڑھنے سے پہلے کافی کا ایک گھونٹ پیتے ہیں کہ پولیس کا سپاہی آجاتا ہے اور کہتا ہے "چلو میرے ساتھ" آپ پوچھتے ہیں "کیا گرفتار کر رہے ہو یا پوچھ گچھ کے لیے لے جانا چاہتے ہو؟" وہ کہتا ہے "مجھے نہیں معلوم" پھر آپ پوچھتے ہیں۔ "کیا ٹوتھ برش اور شیونگ کا سامان ساتھ لے لوں؟" وہ جواب دیتا ہے۔ "ٹائم نہیں ہے"

آپ ایک افسر کے سامنے لے جاکر بٹھائے جاتے ہیں جس کی پشت کی دیوار پر "ہرزل" (HERZL) کی تصویر لٹکی ہوئی ہے۔ وہ نہایت نرمی سے کہتا ہے "یہ میری بڑی عزت ہے کہ میں تمہیں گرفتار کر رہا ہوں" اور آپ جواباً عرض کرتے ہیں "اور یہ میری بھی بڑی عزت ہے کہ میں آپ کو یہ عزت دے رہا ہوں۔ لیکن آپ از راہِ کرم اتنا بتائیں کہ میرا قصور کیا ہے؟" افسر کہتا ہے "سرکس کے دروازے پر تربوز پھٹنے سے ریاست کی سلامتی کو جو خطرہ پیدا ہوا تھا اس کے ذمہ دار تم ہو" ایک تربوز، ریاست اور سرکس ——— کیا اچھوتا اتفاق ہے!

قانون کے مطابق زیرِ حراست رہنے کی مدت گزر جاتی ہے اور آپ انتظار کرتے ہیں کہ اب آپ کو عدالت میں لے جایا جائے گا اور آپ پولیس کی گاڑی کی سلاخوں سے خوبصورت شہر کا نظارہ کر سکیں گے۔ بلکہ آپ تو اتنے پُر اُمید ہوتے ہیں کہ عدالت جاکر آپ رہا ہو جائیں گے۔ "ٹھہرو ابھی" آپ قانون کا حوالہ دیتے ہوئے احتجاج کرتے ہیں لیکن آپ سے کہا جاتا ہے۔ "ہم تمہیں حراست کی مدت سے ایک گھنٹہ بھی زائد نہیں رکھیں گے۔ کیا سمجھتے ہو؟ یہاں قانون کا پورا خیال کیا جاتا ہے۔ یہ اسرائیل ہے۔ کوئی عرب ملک نہیں ہے"

آپ کا ذہن ذرا دیر کو دنیا کی طرف جاتا ہے اور آپ انتظار کرتے ہیں۔ لیکن یہ انتظار کس لیے؟ کیا عرب دنیا سے تحقیقاتی افسر آئے گا؟

آخر کار آپ کو دوسرے کمرے میں ڈال دیا جاتا ہے جہاں چند افسر اور ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوتی ہے۔ ایک افسر آپ سے پوچھتا ہے "عبرانی بول سکتے ہو؟" پھر وہ الزامات کی فہرست پڑھنے لگتا ہے۔ تم نے اسرائیلی ریاست کو تباہ کرنے کے لیے کام کیا ہے۔ آپ فوراً پوچھتے ہیں "آپ کا مطلب ہے ریاست یا تربوز؟"

وہ بدصورت اور بوڑھی عورت بول پڑتی ہے "عدالت کا احترام کرو" آپ حیران ہوتے ہیں "کیسی عدالت؟" وہ چیختی

ہوئی کہتی ہے۔ "یہ عدالت ہے اور میں جج ہوں"

اب آپ کی سمجھ میں آتا ہے کہ انھوں نے آپ کا خیال رکھتے ہوئے اتنی زحمت کی ہے کہ عدالت کو ہی جیل خانے میں لے آئے ہیں۔ آپ اس طرح کی کارروائی کو مسترد کرتے ہیں اور دوبارہ گرفتار کر لیے جاتے ہیں۔

آپ ٹیکسی ڈرائیور سے عبرانی میں باتیں کر رہے ہیں۔ ڈرائیور پوچھتا ہے۔ "کہاں چلیں گے جناب؟"۔ آپ کہتے ہیں "متبنّی اسٹریٹ"۔ پھر آپ سگریٹ جلاتے ہیں اور دوسرا سگریٹ ڈرائیور کو بھی پیش کرتے ہیں کیوں کہ ڈرائیور بڑا مہذب نظر آتا ہے۔ یکایک وہ کہتا ہے۔ "یہ بتائیں کہ آخر یہ واہیات حالت کب تک رہے گی؟ ہم تو تنگ آ گئے ہیں"۔ آپ سمجھتے ہیں کہ یہ مسلسل جنگی حالت اور انکم ٹیکس میں اضافے اور دودھ کی بڑھتی ہوئی قیمتوں سے تنگ آیا ہوا ہے۔ آپ کہتے ہیں "ٹھیک کہتے ہو۔ ہم سب پریشان ہیں"۔ پھر وہ کہتا ہے۔ "آخر کب تک ہماری ریاست ان گندے عربی ناموں کو قائم رکھے گی؟ ہمیں چاہیے کہ ان کا نام و نشان مٹا دیں"۔ آپ پوچھتے ہیں "کن کا؟" وہ کہتا ہے "عربوں کا اور کن کا"۔ آپ پوچھتے ہیں "کیوں"۔ وہ کہتا ہے "اس لیے کہ یہ بڑے گندے ہیں"۔

آپ اس کے لہجے سے اندازہ لگاتے ہیں کہ یہ مراکش سے یہاں آ کر آباد ہوا ہے اور آپ پوچھتے ہیں "کیا واقعی میں اتنا گندہ ہوں؟ اور مثال کے طور پر تم کیا مجھ سے زیادہ صاف ہو؟" وہ آپ کے سوال سے چونک جاتا ہے اور کہتا ہے۔ "کیا مطلب؟"۔ پھر آپ اس سے کہتے ہیں کہ ذرا ذہن سے کام لو اور سوچا بھی کرو۔

اور جب وہ آپ کا شناختی کارڈ دیکھ کر یقین کر لیتا ہے کہ آپ عرب ہیں تب وہ کہتا ہے۔ "میرا مطلب عیسائیوں سے نہیں تھا مسلمانوں سے تھا"۔ اور جب آپ کہتے ہیں۔ "میں مسلمان ہوں"، تب وہ کہتا ہے۔ "میرا مطلب مسلمانوں سے نہیں ہے میں تو یہودیوں کے بارے میں کہہ رہا تھا"۔ پھر جب آپ کہتے ہیں کہ میں ایک نہایت پسماندہ گاؤں کا رہنے والا ہوں جسے ریاست کے بلڈوزر چلا کر زمین کے نقشے سے ہی مٹا دیا ہے۔ تب وہ بڑی طمانیت سے کہتا ہے "ریاست زندہ باد!"

آپ ٹیکسی سے اتر کر اپنے گھر کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ سڑکوں اور گلیوں کے نام آپ کو پڑھنا ہی پڑتے ہیں جنھیں انھوں نے اس طرح تبدیل کر دیا ہے جیسے صلاح الدین کی جگہ شلومو، لیکن آپ حیران ہوں گے کہ انھوں نے المتبنّی کے نام کو کیسے رہنے دیا۔ آپ پہلی دفعہ عبرانی میں اس نام کو پڑھتے ہیں تو یہ "ماؤنٹ نیبو" بن گیا ہے۔ المتبنّی نہیں جیسا کہ آپ کا خیال تھا۔

آپ یروشلم جانے کے لیے ایک دن کا پرمٹ لینا چاہتے ہیں۔ آپ ٹیلی فون اٹھا کر تھانے میں اس افسر کو پوچھتے ہیں جو شہروں کے امور کا انچارج ہے۔ وہ آپ کا جاننے والا بھی ہے۔ آپ اس سے ایک دن کے سفر کا پرمٹ مانگتے ہیں۔ وہ کہتا ہے "تحریری درخواست دو"۔ آپ اپنا دفتر چھوڑ کر درخواست دے آتے ہیں اور انتظار کرتے ہیں۔ ایک دن۔ دو دن۔ تین دن۔ اب بھی آپ کو امید ہے اس لیے کہ انھوں نے اب تک نفی میں جواب نہیں دیا ہے۔ آپ انتظار کر رہے ہیں اور یروشلم میں آپ جن سے ملنا چاہتے ہیں ان سے ملنے کا وقت بھی قریب آتا جا رہا ہے۔

آپ ان سے پوچھتے ہیں۔ گزارش کرتے ہیں۔ استدعا کرتے ہیں کہ کچھ تو کہو۔ آخر "نہیں" کہہ دو تاکہ آپ نہ آنے کی اطلاع دے دیں۔ لیکن وہ کچھ نہیں کہتے۔ آخر آپ پھر زور دے کر کہتے ہیں کہ صرف چند گھنٹے ملاقات کے لیے رہ گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "ایک گھنٹے بعد آؤ پھر بتایا جائے گا کہ تمہاری درخواست کا کیا بنا"۔

آپ ایک گھنٹہ بعد جاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ دفتر بند ہے۔ آپ کو اُلجھن ہوتی ہے کہ آخر یہ معمول کے مطابق صاف طور پر انکار کر سکتے تھے، اس طرح ٹال مٹول کا مقصد کیا تھا۔ آپ کو غصّہ آجاتا ہے اور آپ احمقانہ طور پر فیصلہ کرتے ہیں کہ اسٹیٹ سیکوریٹی پولیس کو درخواست دے کر سفر شروع کیا جائے۔

دوسرے دن آپ گرفتار ہو کر ایمرجنسی فوجی عدالت میں لائے جاتے ہیں اور اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔ اس دوران آپ عجیب وغریب واقعات سنتے ہیں۔

ایک عرب عورت جو ایک زرعی فارم میں کام کرنے جاتی ہے اسے پرمٹ میں اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ راستے میں کہیں اُتر جائے۔ ایک مرتبہ وہ مجبوری اور ضروریات کے تحت اُتر گئی تو گرفتار کر لی گئی۔

اسی طرح چند نوجوان جنھیں صرف بڑی سڑک پر چلنے کی اجازت تھی، ساتھ والی گلی میں چلے گئے تو انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ یہاں کی عدالت کسی کو بری نہیں کرتی ہے۔ قید اور جرمانہ، جرمانہ اور قید۔ اور آپ کو اس بوڑھے اور گدھے اور پرمٹ کا واقعہ تو یاد ہی ہوگا۔

بوڑھا کھیت میں ہل چلا رہا تھا۔ اس نے اپنا کوٹ ایک درخت میں لٹکا دیا تھا اور پرمٹ اسی کوٹ کی جیب میں تھا۔ اسی عرصے میں اس نے دیکھا کہ اس کا گدھا دوسرے کے کھیت میں چلا گیا ہے۔ وہ پھرتی سے گدھے کو واپس لانے کے لیے گیا کہ فوجی پولیس نے اسے دھر لیا کیوں کہ وہ بغیر پرمٹ کے ریاست کی زمین میں داخل ہو گیا تھا۔ اس نے پولیس والے سے کہا۔ "میرے پاس پرمٹ ہے اور وہاں اس درخت پر جو کوٹ لٹکا ہوا ہے اس کی جیب میں رکھ آیا ہوں"، لیکن اس کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ وہ گرفتار کر لیا گیا۔

اور آپ کو موت کا پرمٹ بھی یاد ہوگا۔ کسانوں کو اس بات کے لیے دستخط کرنے پڑتے ہیں کہ اگر وہ فوج کی بچھائی ہوئی سرنگوں سے ہلاک ہوئے تو وہ خود اپنی موت کے ذمّہ دار ہوں گے اس طرح ریاست بالکل بری الذمّہ ہو جاتی ہے اور کسان مستقبل میں ہونے والی موت سے زیادہ دو وقت کی روٹی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جو مر گئے سو مر گئے اور جو بچ گئے سو بچ گئے۔ اور ریاست ہلاک ہونے والوں کی زمین کو بحق سرکار ضبط کر لیتی ہے۔

اور آپ کو تو یہ بھی یاد ہونا چاہیے کہ ایک بچّی باپ کی گود میں عین فوجی گورنر کے دفتر کے سامنے فوت ہو گئی کیوں کہ اس کا باپ اپنی بیمار بچّی کو علاج کے لیے لے جانے کے پرمٹ کا انتظار کر رہا تھا۔

اور آپ پھر بھی اسے غنیمت سمجھتے ہیں کہ آپ کو صرف دو مہینے کی قید بھگتنی پڑتی ہے۔ جہاں آپ اپنے ملک کے نغمے گاتے ہیں، اپنی بچّی کو خط لکھتے ہیں اور جمہوریت سے متعلق مضمون پڑھتے ہیں۔ پھر آپ آزادی یا موت کے قصّے پڑھتے ہیں لیکن نہ آپ آزاد ہوتے ہیں نہ مرتے ہیں۔

آپ اخبار میں کرائے کے مکان کا اشتہار دیکھتے ہیں۔ فوراً کیفے جا کر ٹیلی فون اٹھاتے ہیں۔ "مادام، میں نے آپ کا اشتہار دیکھا ہے۔ کیا میں مکان دیکھ سکتا ہوں؟"، اور اس کی ہنسی آپ کو پُر امید بنا دیتی ہے۔ "ضرور آیئے، مکان بہت عمدہ ہے۔ ماؤنٹ کارمیل پر واقع ہے۔ کرایہ صرف دو سو پونڈ۔ آپ کے لیے بڑا سنہری موقع ہے۔ فوراً آکر محفوظ کرا لیں۔"

آپ جاتے ہیں۔ خاتون آپ کو مکان دکھاتی ہے۔ آپ کو کرائے کی ادائیگی کا طریقہ اور قبضے کی تاریخ اور مکان سب کچھ

پسند ہے۔ اور جب آپ کرایہ نامے پر دستخط کرنے لگتے ہیں تو جیسے اس خاتون پر بجلی گر پڑتی ہے۔ "کیا؟ عرب؟، معاف کیجیے جناب کل بات کیجیے گا۔" اور اسی طرح کا واقعہ ہفتہ در ہفتہ آپ کے ساتھ پیش آتا رہتا ہے اور آپ دو باتوں میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ ایک تو صحافت میں اور دوسرے کرائے کا مکان تلاش کرنے میں۔ لیکن ہر مرتبہ آپ مایوس ہو کر اپنی رہائش گاہ کو لوٹتے ہوئے بالکونیوں کو دیکھتے ہیں اور ان مکانوں کی تاریخ آپ کے ذہن میں دوڑ جاتی ہے۔ آپ سوچتے ہیں کہ ان مکانوں کے مالک ہجرت اور جلاوطنی کے بعد کہاں گم ہو گئے۔ کتنوں نے یہ بلڈنگیں بنائیں اور انھیں اس میں رہنے کی اجازت نہ ملی۔ اب بھی ان مکانوں کے مالکان چابیاں اپنی جیبوں میں رکھے اور ان کا خیال اپنے دلوں میں لیے واپسی کے منتظر ہیں۔ لیکن کہاں؟ کیا کبھی ان میں سے کسی کو اس بات کی اجازت ہوگی کہ وہ اپنے مکان کا دروازہ اپنی چابی سے کھول سکے گا؟ یا وہ اپنے مکان کا ایک کمرہ بھی کرائے پر دے سکے گا؟

وہ کہتے ہیں کہ صیہونیت نے کوئی جرم نہیں کیا۔ صرف اتنا کیا ہے کہ بے ملک کے لوگوں کو ایسے ملک میں لا بسایا، جہاں لوگ نہیں تھے۔ اور جب آپ ان سے پوچھیں کہ ان مکانوں کو کن لوگوں نے بنایا تھا، کیا وہ دیومالائی مخلوق تھی جو مکان بنا کر ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ تب وہ پیٹھ پھیر لیتے ہیں۔ اور لوٹ کھسوٹ کے ان مکانوں میں اور بچے لے آتے ہیں۔

آپ جب پاسپورٹ کے لیے درخواست دیتے ہیں تب انکشاف ہوتا ہے کہ آپ تو یہاں کے شہری ہی نہیں ہیں۔ کیوں کہ آپ کے والد یا آپ کے رشتہ دار فلسطین کی جنگ کے موقع پر بچپن میں آپ کو لے کر محفوظ مقام پر چلے گئے تھے اور کوئی عرب جو اس عرصے میں ملک چھوڑ کر چلا گیا تھا اب دوبارہ واپس آنے پر یہاں کا شہری نہیں رہا ہے۔ اب آپ پاسپورٹ کے بجائے پروانۂ راہ داری کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ اس وقت آپ کو پتہ چلتا ہے کہ آپ تو اسرائیل کے باشندے بھی نہیں ہیں کیوں کہ آپ کے پاس رہائشی پرمٹ نہیں ہے۔ آپ پہلے تو اسے مذاق سمجھتے پھر آپ اپنے ایک دوست وکیل سے جا کر کہتے ہیں۔ "میں نہ تو یہاں کا شہری ہوں اور نہ باشندہ، تو پھر میں کہاں ہوں اور کیا ہوں؟" اور وکیل قانون کی تشریح کرتا ہوا بتاتا ہے کہ قانون کی رو سے آپ کو ثابت کرنا پڑے گا کہ اس سرزمین میں آپ موجود ہیں۔ تب آپ کو احساس ہوتا ہے کہ آپ کا وجود طبعی طور پر تو ہو سکتا ہے، قانونی طور پر نہیں۔

آپ قانون پر غور کرنے لگتے ہیں۔ اوہ! کتنی بڑی بھول ہے کہ ہم قانون کو حق اور انصاف کا ضامن سمجھتے رہے ہیں۔ یہاں تو قانون صرف حکومت کے اداروں اور حکمرانوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔

اور میں اس ملک میں اس ریاست کے وجود سے پہلے سے موجود ہوں اور یہی میرا قصور ہے کہ میرے وجود سے انکار کیا جا رہا ہے۔

آپ ایک مرتبہ پھر محسوس کرتے ہیں کہ سچائی کے پیچھے جب تک طاقت نہ ہو ایک عجوبہ بن جاتی ہے۔ طاقت ہی اسے عجوبہ سے حقیقت میں تبدیل کر سکتی ہے۔ اور آپ ایسے قانون پر مسکرا دیتے ہیں جو دنیا بھر کے ہر یہودی کو خود بخود اسرائیل کی قومیت کا حق عطا کرتا ہے۔

چلیے آپ نے کسی طرح یہ سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا کہ آپ کا وجود ہے اور آپ یہاں موجود ہیں اور آپ کو پروانۂ راہ داری بھی مل گیا ہے لیکن آپ گزریں گے کہاں سے؟ آپ حائفہ کے رہنے والے ہیں اور ایئرپورٹ تل ابیب کے پاس ہے۔ آپ پولیس میں درخواست دیتے ہیں کہ آپ کو حائفہ سے ایئرپورٹ تک جانے کا اجازت نامہ دیا جائے لیکن آپ کی درخواست نامنظور ہو جاتی ہے۔

آپ سوچتے ہیں اور پھر آپ کو خیال آتا ہے کہ آپ ان سے کہیں زیادہ ذہین ہیں۔ آپ اپنا راستہ بدل دیتے ہیں اور فیصلہ کرتے ہیں کہ حائفہ کی بندرگاہ پہنچ کر بحری جہاز سے سفر شروع کیا جائے۔ اس لیے کہ حائفہ کا باشندہ ہوتے ہوئے آپ کو بندرگاہ تک جانے کا پورا

حق ہے۔ آپ ٹکٹ خرید تے ہیں۔ امیگریشن، ہیلتھ اور کسٹم والوں سے بھی گزر جاتے ہیں۔ آپ کو کوئی نہیں روکتا لیکن جہاز پر سوار ہوتے ہوئے آپ کو گرفتار کر کے عدالت لے جایا جاتا ہے۔ آپ اصرار کرتے ہیں کہ اس مرتبہ قانون آپ کی طرف ہے۔ لیکن عدالت میں انکشاف ہوتا ہے کہ حائفہ کی بندرگاہ اسرائیلی ریاست کا حصّہ ہے نہ کہ حائفہ شہر کا۔ اور وہ آپ کو آگاہ کرتے ہیں کہ آپ کو حائفہ سے باہر اسرائیل کے کسی حصّے میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اور چوں کہ حائفہ کی بندرگاہ قانون کے مطابق حائفہ سے باہر ہے اس لیے آپ مجرم قرار دیے جاتے ہیں۔

آپ ان سے کہتے ہیں۔ "جنابِ والا! اب جب کہ میں قانون کو سمجھ چکا ہوں، چند اور خلاف ورزیوں کا اقرار کرنا چاہتا ہوں میں روزانہ سمندر میں نہاتا ہوں اور سمندر اسرائیلی ریاست کا حصّہ ہے نہ کہ حائفہ کا، لیکن میرے پاس پرمٹ نہیں ہے۔ اور جو میں حائفہ کے اوپر آسمان دیکھتا ہوں وہ بھی حائفہ کا حصّہ نہیں ہے۔ اور میرے پاس سمندر سے آتی ہوئی ہواؤں میں سانس لینے کا بھی پرمٹ نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔" اور وہ مسکرا دیتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کی نئی کتاب

اُردو ادب کی تحریکیں

امیر خسرو سے لے کر عہدِ حاضر تک اُردو ادب کی اہم تحریک کا تجزیہ۔
اس کتاب پر مصنّف کو پنجاب یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی۔
یہ کتاب سی ایس ایس کے امتحان اور ایم اے اُردو کے چوتھے پرچے کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔

چند مندرجات

ریختہ کی دو تحریکیں — ایہام کی تحریک — اصلاحِ زبان کی تحریک
علیگڑھ تحریک — فورٹ ولیم کالج — انجمن پنجاب کی تحریک
رومانوی تحریک — ترقی پسند تحریک — حلقۂ اربابِ ذوق
اقبال کی تحریک — اسلامی ادب کی تحریک — ارضی ثقافتی تحریک

ملنے کا پتہ

انجمن ترقی اُردو پاکستان، بابائے اُردو روڈ۔ کراچی ۱

گلہائے رنگ رنگ

سندھی کہانی

رشید بھٹی / آفاق صدیقی

خُداداد

بات یہ ہے کہ میرا ایک دوست جس نے ایم۔ اے کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا تھا کچھ دنوں سے اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے امتحانوں کی تیاری میں مشغول تھا۔ عام معلوماتی کتابوں کے علاوہ ایک دو انسائیکلوپیڈیا بھی اس کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔

اس بات سے پہلے جس نے میرے دل میں خداداد کی یاد تازہ کی، میں آپ کو اپنے اس دوست کی قابلیت کے متعلق کچھ بتاتا چلوں۔ پچھلی گرمیوں میں یہ ہمارے ساتھ کوئٹہ گئے۔ ایک دن وہاں کسی باغ میں گھومتے گھماتے میں نے قریب قریب سبھی پیڑ اور پودوں کے نام بتائے لیکن جب ہم باغ سے باہر آئے تو میرے دوست نے شکایت کی کہ میں نے اس کو ایک خاص چیز تو دکھائی ہی نہیں۔ میں نے پوچھا، وہ کیا؟ تو فرمانے لگے "تم نے تربوزوں کی بیل مجھے کب دکھائی؟"

ایک دن چائے پیتے ہوئے کہا۔ "مجھ سے کوئی معلوماتی سوال پوچھو" میں نے دریافت کیا۔ "بتاؤ چوائین لائی کون تھا؟" اس سوال پر وہ بڑی سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد چہک کر بولے "یار! کیوں مذاق کرتے ہو، یہ تو کوئی ..... دوا ہے"

میں سوچنے لگا کہ جب ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ دوست کا یہ عالم ہے تو بیچارے خداداد پر لعن طعن کیوں۔ وہ غریب تو دو چار جماعتیں بھی پاس نہ کر پایا تھا۔

خداداد ہمارے محلّے میں سیٹھ محمد پریل میمن کے پاس آتا تھا اور فرصت کے اوقات میں سیٹھ کے کچھ کام کر دیا کرتا تھا۔ اسے سکھّر میں آئے ہوئے سال ڈیڑھ سال ہی ہوا تھا۔ تعلیمی لحاظ سے وہ بالکل کورا تھا۔ والدین نے ایک اسکول میں داخل تو کرایا تھا مگر ایک دن جب کہ وہ الف۔ بے ہی پڑھ رہا تھا۔ ماسٹر صاحب نے اسے اکنّی دے کر چنے لانے کو بھیجا۔ اتفاق کی بات اکنّی اس کے ہاتھ سے کہیں گر گئی اور کسی دوسرے کے ہاتھ لگی۔ یہ بیچارہ خوف کے مارے پھر کبھی اسکول نہ گیا۔ تھوڑے بہت حروف جو پہچان گیا تھا ان کی بدولت شہر میں رہ کر راستوں، دکانوں اور سینماؤں کے بورڈ پڑھنے لگا تھا اور پھر کوشش کرتے کرتے آسان عبارتیں بھی سمجھ میں آنے لگی تھیں۔

شام کو وہ کام کاج سے فارغ ہو کر محلّے کی مسجد کے کنویں پر آجاتا جو میرے دروازے کے قریب ہی تھا اور جہاں ہم لوگ جمع ہو کر مذہبی، سیاسی، سماجی اور ادبی گفتگو کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ خداداد بھی اس گفتگو میں شریک ہونے لگا۔ کبھی کبھی وہ "سائیں! گستاخی معاف" کہہ کر اپنی رائے بھی ظاہر کر دیتا۔

ایک مرتبہ میرے ایک کامریڈ دوست سماجی مسائل پر گرما گرم بحث کر رہے تھے۔ اس وقت مرحوم خداداد وہاں براجمان تھا اور بڑے غور سے کامریڈ کی تقریر سن رہا تھا۔ اس کو متوجہ دیکھ کر کامریڈ بھی اسی کو مرکزِ نگاہ بنائے ہوئے تھے۔ اور تقریر شیطان کی آنت بنتی جا رہی تھی۔ سماجی نظام پر بھرپور وار کرتے ہوئے وہ فرما رہے تھے کہ "اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری معاشی حالت بہتر ہو اور ہم اجتماعی خوش حالی کی طرف آگے بڑھیں تو موجودہ گندے اور رِستے ہوئے ناسوروں والے نظام کو درہم برہم کر کے نیا نظام لانا ہوگا۔"

اتنا کچھ کہنے کے بعد کامریڈ نے ہم سب کی طرف داد طلب نظریں گھمائیں اور تائیدِ مزید کے منتظر رہے۔ خداداد نے دیکھا کہ اور تو سب خاموش ہیں، اب اسے ہی کچھ بولنا چاہیے۔ اتنے میں کامریڈ بھی اس کی طرف رُخ کر کے بولے "کیوں بھائی! تمہاری کیا رائے ہے؟"

"ہاں سائیں! وہی نظام حیدر آباد دکن والا نا؟ وہ تو واقعی بے کار اور کنڈم آدمی ہے۔ اس کو گدی سے ضرور ہٹا دینا چاہیے۔" خداداد نے بڑے اعتماد سے یہ تبصرہ فرمایا اور ہم سب زیرِ لب مسکرا کر رہ گئے۔

ہاں تو ذکر تھا میرے لائق و فائق دوست کا جس نے عوامی جمہوریہ چین کے وزیر اعظم کو چھِّر مار دو کہہ کر نہ صرف مجھے خدن کے اس واقعہ کی یاد دلا دی تھی بلکہ اس کی پوری زندگی میرے ذہن کے پردے پر اپنے جھلملاتے عکس چھوڑ گئی تھی۔ ایسا تو نہیں کہ اس کی زندگی کوئی اتنی پُر کشش، رشک آفریں اور ہنگامہ آرائیوں سے پُر تھی جو میں بھلائے سے بھی نہ بھول سکوں۔ اس کی مسکینیت تو اتنی سادہ اور بے سہارا تھی کہ مرنے کے بعد اس کا کوئی نام لیوا بھی نہ رہا۔ سکھر کے لیے تو وہ بالکل گمنام سا تھا۔ تاہم مجھے اس کی ہستی میں ایک عجیب مستی نظر آتی تھی۔

سکھر آنے کے بعد وہ بالکل خاموش اور گمنام زندگی گزارنے لگا تھا۔ کسی کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ کہاں سے آیا ہے، کون ہے اور دنیا میں اس کا کوئی عزیز رشتے دار ہے بھی یا نہیں؟ اس نے کسی سے بھی تعلقات بڑھانے کی کوشش نہ کی اس لیے کوئی بھی اس کے زیادہ قریب نہ آسکا۔ مگر میرا تجسس اسے دیکھ دیکھ کر نہ جانے کیوں بڑھتا گیا اور بڑی کوششوں کے بعد میں اس کے دبے ہوئے زخموں کو کریدنے میں کامیاب ہو سکا۔

وہ ضلع جیکب آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کے باپ کی اچانک موت کے بعد ورثے میں اسے بیس پچیس ایکڑ زمین اور کچھ نقدی ملی تھی۔ گاؤں میں اپنے ہی کسی رشتے دار کی بیٹی سے اس کی شادی ہوئی اور شادی کے بعد تین چار سال بڑے خوش گوار گزرے۔ وہ صاحبِ اولاد بھی ہوا۔ مگر ایک خوبرو نوجوان جو قریب کا رشتہ دار بھی تھا، اس کی بیوی نے اس نوجوان کو اپنا لیا۔ جب خداداد کو اس کا علم ہوا تو اس نے ذات برادری اور گاؤں والوں کو بیچ میں لائے بغیر اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور عدت کی مدت گزارنے کے بعد اپنے خرچ پر مطلقہ بیوی کی شادی اس کی پسند کے نوجوان سے کر دی۔ یہی نہیں بلکہ جو بچی کھچی زمین اور پونجی تھی وہ بھی اپنے بیٹے اور نئے جوڑے کے نام کر دی پھر وہ گھر بار چھوڑ کر چپکے سے سکھر آگیا اور یہاں محنت مزدوری کر کے کچھ الگ تھلگ سا رہنے لگا۔

پچھلی محرومیوں اور ذہنی کرب ناکی نے اس کے چال چلن اور رہن سہن میں عجیب انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ سکھر میں

جو وقت اس نے گزارا سوائے ہمارے حلقے کے کسی سے اس کی جان پہچان نہ ہو سکی۔ صبح ہوتے ہی وہ کام پہ چلا جاتا، شام کو واپس آکر نہاتا دھوتا اور ہماری چوپال میں آبیٹھتا اور پھر وہاں سے رات کو ایک کارخانے میں کام کرنے چلا جاتا۔ میں نے کبھی اسے آوارہ گردی کرتے ہوئے نہیں پایا۔ وہ زیادہ تر چپ چپ رہتا۔ میرے سوالوں میں سے کچھ کے تو وہ واجبی سے جواب دیتا اور بیشتر سوالوں کو ہوں، ہاں اور ناں پہ ٹال جاتا۔

سیٹھ پریل اسے چالیس روپیہ مہینہ تنخواہ، سال میں دو ایک جوڑے اور کھانا دیتا تھا۔ میں نے کبھی اسے اپنے طور پہ کوئی کپڑا خریدتے نہیں دیکھا۔ کسی اور شوق پہ بھی وہ اپنی کمائی خرچ نہ کرتا۔ ہم اکثر سوچتے اور آپس میں بات چیت کرتے کہ آخر خدّن جو کچھ کماتا ہے وہ کہاں خرچ کرتا ہے؟ اس راز سے پردہ اس وقت ہٹا جب میں ایک مرتبہ سخت بیمار ہو کر مقامی ہسپتال کے اِن ڈور وارڈ میں داخل تھا۔ خدّن میری مزاج پرسی کے لیے آیا اور کچھ دیر میرے پاس رہ کر چلا گیا۔ اسی وقت ایک وارڈ بوائے نے بڑے رازدارانہ طور پر مجھے بتایا "سائیں! یہ تو پاگل درویش ہے پاگل درویش"۔

"وہ کیسے؟" میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"سائیں! یہ تو جب بھی آتا ہے تو غریب اور لاوارث مریضوں میں بہت سے پیسے تقسیم کرتا ہے"

کچھ دنوں کے بعد دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی۔ فوجی بھرتی کی ٹیم سکھر آئی تو خدّن بھی سپاہیوں میں بھرتی ہو گیا اور اسے ابتدائی تربیت کے لیے کوئٹہ بھیج دیا گیا لیکن ایک مہینہ مشکل سے ہوا تھا کہ وہ پھر سکھر آ گیا۔ میں نے پوچھا تو بتایا کہ "میڈیکل اَن فٹ کر کے واپس بھیج دیا گیا ہوں"

کافی عرصے تک وہ بے کار گھومتا رہا آخر کار میں نے اپنے چچا سے کہہ سُن کر اسے ان کے پاس ملازم رکھوا دیا اور وہ اسے اپنے ساتھ گاؤں لے گئے قریب قریب چار مہینے وہاں رہا اور پھر اچانک بوریا بستر سمیٹ کر واپس آ گیا۔ واپسی کا سبب خدّن نے تو مجھے نہ بتایا البتہ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ بعد چچا کی زمینوں کا ایک کارندہ آیا تو اس سے معلوم ہوا کہ گاؤں کی مسجد میں فرقہ وارانہ فساد برپا ہوا۔ خدّن یہ کہہ کر بیچ بچاؤ کی کوشش کر رہا تھا کہ "مسجد خدا کا گھر ہے اس میں جھگڑا نہ کرو" لیکن کسی نے اس کی نہ سُنی بلکہ بیچ بچاؤ کرنے میں الٹی پٹائی اسی کی ہو گئی۔

کئی مہینے تک سکھر میں رہتے ہوئے بھی وہ مجھ سے نہیں ملا اور میں بھی اپنی مصروفیت کے سبب اتنا وقت نہ نکال سکا جو اسے تلاش کرتا۔ ان دنوں ویسے بھی مسجد منزل گاہ کا تنازعہ شدت اختیار کر چکا تھا۔ پورا شہر فرقہ وارانہ فسادات کی لپیٹ میں تھا اور ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ آخر کار غیر معیّنہ مدت کے لیے کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ ایک دن جب کہ کرفیو کی پابندی میں کچھ وقفہ دیا گیا تو وہ بہت گھبرایا ہوا میرے پاس آیا اور بڑی عجلت میں اپنے آنے کا مقصد بیان کرنے لگا۔

"سائیں! آج کل بہت کڑکی ہے، بس آپ مجھے فوراً دس روپیہ قرض دے دیں" کرفیو لگنے میں ابھی دس پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں اسے زیادہ روک بھی نہ سکتا تھا۔ اس لیے دس روپیہ اسے دے دیے اور وہ جانے لگا۔ میں نے اسے سمجھایا بھی کہ "اتنی کیا جلدی ہے، شام ہونے کو ہے اب میرے ہی پاس رہ جاؤ صبح چلے جانا" وہ نہ مانا اور پھر آنے کا وعدہ کر کے تیز تیز

قدم اٹھاتا ہوا غائب ہو گیا۔

دوسرے دن خبر ملی کہ کل شام کو قتل و غارت گری کے سلسلے میں خداداد کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میں بہت پریشان ہوا لیکن اسے دیکھنے اور اس سے ملنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ بڑی کوششوں کے بعد مقدمے کی سماعت کے دوران ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا۔ "جس دن شام کو میں تمہارے پاس سے آ رہا تھا شاہی بازار میں تین لاشیں مجھے خون میں لت پت نظر آئیں۔ قریب گیا تو دیکھا کہ ایک میں زندگی کے کچھ آثار باقی ہیں۔ اس وقت ہر طرف سناٹا تھا۔ میں اس زندہ لاش کی مدد کرنے کے لیے رک گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ہمدردی میرا جرم بن جائے گی۔ اور میں قتل کے جرم میں گرفتار کر لیا جاؤں گا۔"

ایک دن خبر ملی کہ خدن کو بھی چند دوسرے ملزموں کے ساتھ عمر قید کی سزا سنا دی گئی ہے۔ اس کے بعد جیل میں وہ کیسا رہا اس کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے اسے سزا پانے سے پہلے ہی بھلا دیا تھا، حالاں کہ اس نے مجھے برابر یاد رکھا اور جیل سے دس روپیہ کا منی آرڈر بھیج کر وہ قرض بھی ادا کر دیا جو مجھ سے لیا تھا۔

پاکستان وجود میں آیا تو اس کی خوشی میں بہت سے قیدیوں کو آزادی نصیب ہوئی اور اس طرح خداداد بھی رہائی پا کر سیدھا میرے پاس آیا۔ بات چیت کے دوران اس نے بڑی بے قراری سے ان گنے چنے دوستوں کے بارے میں پوچھا جو ہماری چوپال میں بیٹھا کرتے تھے۔ میں نے دکھے دل سے کہا۔ "سب چلے گئے۔"

"سب چلے گئے،" اس نے بڑے غم زدہ لہجے میں دہرایا اور اچانک یہ کہتا ہوا بڑی بیزاری سے اٹھ کھڑا ہوا "سائیں! جب سب ہی چلے گئے تو اب ہم بیٹھ کر کیا کریں۔"

وہ سارا سارا دن شہر کی گلیوں اور کوچوں میں گھومتا پھرتا رہتا اور رات کو کسی دکان کے آگے نکلے ہوئے تختے یا چبوترے پر سو جاتا۔ ہفتے میں دو تین دن کہیں مزدوری کر لی تو کر لی باقی دنوں کی اسے کوئی فکر نہ ہوتی۔ اتفاقاً کہیں راستے میں ملاقات ہو جاتی تو بڑے تپاک سے سلام کر کے ہنستا اور یہ کہتا ہوا آگے بڑھ جاتا "یار! سب چلے گئے، سب چلے گئے۔"

خداداد اب پوچھنے والوں کو اپنا نام خداداد نہیں بتاتا تھا بلکہ ہاتھ باندھ کر کہتا۔ "بھائی! میں خدن چریو (پاگل) ہوں۔"

میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں شہداد پور چلا گیا اور قریب قریب ڈیڑھ سال کے بعد کچھ دنوں کے لیے سکھر آیا تو ایک پرانے دوست سے خداداد کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ اس نے مجھے بتایا: "خدن واقعی پاگل ہو گیا تھا وہ وزیروں اور بڑے بڑے افسروں کو عجیب احمقانہ خط بھیجتا تھا۔ مثلاً وہ مطالبہ کرتا کہ "جب گاندھی جی کے آدمی بھارت چلے گئے، قائداعظم کے آدمی پاکستان آگئے تو خدا کے بندوں کو خدا کے ملک میں بھیجا جائے۔" ان حرکتوں کی بنا پر ڈاکٹروں کے فیصلے کے مطابق یہ مناسب سمجھا گیا کہ خدن کے لیے بہترین جگہ گدو بندر کا پاگل خانہ ہے۔"

اتفاق کی بات کہ ایک مرتبہ مجھے اپنے ساتھی کے ہمراہ حیدرآباد جانا پڑا۔ کام سے فرصت پائی تو خیال آیا کہ ذرا خداداد کو بھی دیکھ آؤں۔ میں گدو بندر پہنچا اور متعلقہ عملے سے پوچھتا پوچھتا اس وارڈ میں گیا جہاں خداداد کو رکھا گیا تھا۔ اس وقت وہ دوسرے پاگلوں کے ساتھ بڑے موڈ میں باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اشارے سے اسے اپنی طرف بلایا۔ وہ آ تو گیا لیکن پہلے کچھ دیر تک پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے گھورتا رہا اور پھر یہ کہتا ہوا بڑی تیزی سے واپس پلٹ گیا۔ "تم اچھے ہو سائیں! میں تو نہ خداداد پاکستانی ہوں نہ رام ڈنو ہندوستانی۔ بس خدا آبادی خدن چریو ہوں۔"

رفتارِ ادب

(تبصرے کے لیے دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

بیسویں صدی میں اردو ادب _____ مصنف: ڈاکٹر حسرت کاس گنجوی

صفحات: ۵۹۱ ۔ قیمت: ۱۲۵ روپے

پتا: اردو اکیڈمی، سندھ، کراچی

ڈاکٹر حسرت کاس گنجوی معروف ناول نگار ۔ افسانہ نویس اور نقاد ہیں۔ اردو اور انگریزی ادبیات پر عبور رکھتے ہیں۔ "بیسویں صدی میں اردو ادب" ان کے ۳۲ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ مجموعے کی ترتیب یوں ہے کہ ناول و افسانہ سے متعلق ۲۴ مضامین۔ شاعری سے متعلق ۸ مضامین اور ۸ مضامین متفرق موضوعات پر مشتمل ہیں۔

ڈاکٹر حسرت نے ناول اور افسانے کے ضمن میں "لندن کی ایک رات" سے "ایک چادر میلی سی" تک کا احاطہ کیا ہے۔ ممتاز اور معروف افسانہ نگاروں کے ساتھ انھوں نے بعض ایسے فکشن لکھنے والوں کے فن کا جائزہ بھی لیا ہے جو نسبتاً کم معروف ہیں اگرچہ ڈاکٹر صاحب بذاتِ خود ایک معروف فکشن لکھنے والے ہیں تاہم انھوں نے دوسرے لکھنے والوں کے فنی تجزیے میں خلوص۔ دیانتداری اور انصاف سے کام لیا ہے۔ انھوں نے ادب کو عبادت سے تعبیر کیا ہے۔ ادب ان کے نزدیک زندگی اور اس کی عظمتوں کے سمجھنے کا نام ہے۔ اس وجہ سے ان کے تنقیدی مطالعوں میں عظمت کی تلاش اور زندگی کی تفہیم کا سچا جذبہ ملتا ہے۔

شاعری کے حوالے سے اس مجموعے کے تین مضامین جو نظیر۔ جگر اور فیض کے بارے میں ہیں، بڑے اہم اور فکر انگیز ہیں۔ متفرقات میں شاہد احمد دہلوی اور ڈاکٹر احسن فاروقی کے جائزے دلچسپ ہیں۔ ان سے خلوص و محبت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ مصنف نے انصاف اور دیانت کو ہر جگہ مدِ نظر رکھا ہے۔ ہم عصروں پر لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہم جماعت حشمت نیّر کا خاکہ بڑی محبت سے لکھا ہے۔ اس خاکے کو ان کی خوبصورت اور پُرتاثیر تحریروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

"بیسویں صدی میں اردو ادب" اردو تنقید کا ایک متوازن مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیالات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن ان کی سنجیدگی۔ علمی گہرائی اور تنقیدی سوجھ بوجھ اس مجموعے کے ہر مضمون سے پوری طرح ظاہر ہے۔

حقیقتِ شاعری ــــــــــ مصنف: نصیر الدین نصیر

صفحات: ۱۵۰ - قیمت: درج نہیں

پتا: اردو اکیڈمی (یو کے) لمٹیڈ ۱۶ - ونڈرمیر روڈ - لندن - ڈبلیو - ۵

نصیر الدین نصیر کی منظوم کتاب "حقیقتِ شاعری" ۱۹۱۱ء میں مکمل ہوئی اور تکمیل کے بیس برس بعد ۱۹۳۱ء میں علامہ سید سلیمان ندوی کے عالمانہ دیباچے کے ساتھ معارف پریس اعظم گڑھ سے چھپی۔ اس لحاظ سے یہ کتاب کاشف الحقائق (مطبوعہ ۱۸۹۷ء) کے تیرہ چودہ برس بعد مکمل ہوئی۔ کاشف الحقائق کے ذکر کی ضرورت اس لیے آن پڑی کہ دونوں تصانیف کے موضوعات ایک سے ہیں۔ ان میں عالمی ادب و ادیب اور ان کی فنی اقدار زیرِ بحث آئی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ "حقیقتِ شاعری" نظم میں ہے اور کاشف الحقائق نثر میں۔ تقدیم بہرحال کاشف الحقائق کو حاصل ہے۔ اس وجہ سے یہ باور کیا جاتا ہے کہ نصیر الدین نصیر کو عالمی ادب و ادیب پر منظوم خیال آرائی کا خیال کاشف الحقائق کو دیکھ کر آیا ہوگا۔ یوں بھی دونوں حضرات یعنی نصیر الدین نصیر اور نواب امداد امام اثر ہم وطن تھے، ہم عصر تھے اور آپس میں قریبی تعلقات رکھتے تھے۔

علامہ سلیمان ندوی کا "حقیقتِ شاعری" کے بارے میں یہ خیال کہ یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے پہلی کتاب ہے۔ اس میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ بعد کے تبصرہ نگاروں نے بھی۔ اس بارے میں کم و بیش یہی آرا قائم کیں۔

علامہ موصوف نے "حقیقتِ شاعری" کو مثنوی اور علیم اللہ حالی نے تذکرہ کہا ہے، لیکن اس کی تنقیدی حیثیت بھی کم نہیں۔ اس میں کسی شاعر پر ایک شعر میں جو تنقید کی گئی ہے، نثر میں اس کے لیے صفحات درکار ہوں گے۔ مثلاً:

انشا (اردو)	کہیں یہ لاجواب کہتا ہے	کہیں بے آب و تاب کہتا ہے
	علم بے حد مگر خیال نہیں	بات یہ ہے کہ اعتدال نہیں
ملٹن (انگریزی)	اس کی دنیا جو ہے خیالی ہے	اس کی تخئیل ہی نرالی ہے
	اس کی طرزِ بیان صاف نہیں	مطلقاً اس میں اختلاف نہیں
	غیر مانوس لفظ ملتے ہیں	کاوشوں سے جگر بھی ہلتے ہیں

کسی انگریز شاعر پر ایسا محاکمہ وہی کر سکتا ہے جس نے انگریزی ادب کا مطالعہ کیا ہو۔ صاحبِ کتاب نصیر الدین نصیر نے بیرسٹری لندن سے کی تھی لیکن وہ صرف بیرسٹر ہو کے نہیں آگئے۔ ان کو علوم و شعر و ادب کی فضا ورثے میں ملی تھی۔ لہٰذا وہ وہاں انگریزی ادب کو بھی حتی المقدور کھنگالتے اور اپنی ایک رائے قائم کرتے رہے۔

نصیر الدین نصیر صاحب کے پوتے رشید منظر اس لحاظ سے لائقِ تحسین ہیں کہ اپنے دادا کی تقریباً گم شدہ اور نظر سے اوجھل کتاب کو دوبارہ منظرِ عام پر لانے کا اہتمام کر کے کتنے ہی تشنگانِ ادب پر احسان کیا۔

اس کتاب کے تعارفی کلمات سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ ناصر جمالی صاحب نے جناب نصیر الدین نصیر پر سات سو صفحات کا ایک مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ خدا کرے یہ زیورِ طباعت سے جلد آراستہ ہو کر منظرِ عام پر

آجائے تاکہ نصیر صاحب کے اجمالی مطالعہ کی صورت پیدا ہو۔

طشتِ مُراد ———— مصنف: سید سبطِ علی صبا

صفحات: ۱۱۱ ۔ قیمت: ۲۵ روپے

پتا: مجلسِ تصنیف و تالیف، ۲۰۔ ایف/۳۲۰ واہ کینٹ

قاضی عارف حسین ہماری شکر گزاری کے مستحق اس لیے ہیں کہ انھوں نے سبطِ علی صبا کے کلام کو ضائع ہونے سے بچا لیا اور "طشتِ مُراد" کے نام سے ایک دیدہ زیب مجموعہ کلام شائع کر دیا۔ اس طرح قارئین کو سبطِ علی صبا یکجا مل گئے۔

سبطِ علی صبا کی شاعری تمام تر عصری حسیت کا آئینہ دار ہے۔ ان کے شعری تجربے کا اکھوا ان کی جیتی جاگتی زندگی سے پھوٹتا تھا۔ ان کو شعری پیکر میں ڈھالنا اور جدتِ بیان کو بھی قائم رکھنا ایک مشکل امر تھا۔ سبطِ علی صبا نے بہت خوبصورتی سے اپنے شعروں میں نبھایا۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

ہر سمت غم کی دھوپ کے پہرے لگا دیے — کنکر چُنے تو راہ میں شیشے بچھا دیے
مرغزارِ شاعری میں گم رہا سبطِ علی — سو گئی وہ دیکھیے بیمار بیوی رات کو
جب چلی ٹھنڈی ہوا بچہ ٹھٹھر کر رہ گیا — ماں نے اپنے لعل کی تختی جلا دی رات کو
ایسی مجبوری کہ پچھلا در کھلا رہنے دیا — صدر دروازے پہ اک تالا پڑا رہنے دیا

ان اشعار میں سبطِ علی صبا نے اگرچہ ذاتی تجربات بیان کیے ہیں لیکن ان کے کائناتی ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ تنہا سبطِ علی صبا کا دکھ نہیں۔ اگر انھیں عالمی پس منظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو یہ کروڑوں افراد کا دکھ ہے۔ افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ ان کی شاعری ہمیں بہت کچھ دے سکتی تھی۔ پھر بھی جتنا کچھ انھوں نے لکھا وہ تاریخ شعر و ادب میں انھیں تشخص فراہم کرنے کے لیے کافی ہے۔ ان کا یہ شعر کہاں بھلایا جا سکتا ہے۔

دیوار کیا گری مرے خستہ مکان کی — لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے

(۲۔ س)

گفتار ———— مصنف: بشر سیفی

صفحات: ۱۲۸ ۔ قیمت: ۳۵ روپے

پتا: شاخسار پبلشرز، پوسٹ بکس نمبر ۱۰۶۰ ۔ راولپنڈی

۱۹۷۴ء میں، جب میں پنڈی میں تھا تو اس وقت بشیر سیفی ادبی حلقوں میں روشناس ہو رہے تھے۔ نمایاں ہونے کی منزل ابھی نہیں آئی تھی لیکن اس جانب ان کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے اور جب میں ۱۹۷۷ء کے اوائل میں کراچی آگیا تو معلوم ہوا کہ بشیر سیفی کا پہلا مجموعہ کلام "مطلع" منظرِ عام پر آگیا ہے۔ پھر ان کا ایک اہم ادبی کام "شعرائے راولپنڈی" کے انتخاب کی صورت میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک معیاری ماہنامہ "اردو ادب" بھی اپنی ادارت میں جاری کیا اور سب سے

بڑھ کر یہ اردو میں داخل کی نئی صنف " انشائیہ نگاری " پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پرانے اصنافِ ادب پر لکھنا تو اس لیے آسان ہوتا ہے کہ ان پر پہلے سے بہت کچھ لکھا جاچکا ہوتا ہے۔ بشیر سیفی نے کم وقت میں جس تواتر سے اتنے مراحل طے کیے یہ سعادت کم ہی لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔

اب ان کا دوسرا شعری مجموعہ " گفتار " میرے سامنے ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ جن لوگوں نے ان کے پہلے شعری مجموعے " مطلع " کو پڑھا ہوگا وہ اس بات کی تصدیق بہ آسانی کر سکتے ہیں کہ بشیر سیفی کا فن مسلسل آگے بڑھا ہے۔ اس کتاب میں سیفی صاحب کا ایک رُخ ہائیکو نگار کی حیثیت سے سامنے آیا ہے۔ ان کے اس رُخ پر معروف شاعر جمیل ملک نے اپنے فلیپ میں ان کی ہائیکو نگاری پر بہت حوصلہ افزا بات کی ہے۔ اس سے بشیر سیفی کی ہائیکو نگاری کی خصوصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ بشیر سیفی کی ایک غزل کے چند اشعار یہ ہیں۔

میرے پیچھے کارواں کوئی نہیں — تیر رکھتا ہوں کماں کوئی نہیں

پاؤں کے نیچے زمیں کا لمس ہے — اور سر پر آسماں کوئی نہیں

زندگی کرتے کو تو کرتے ہیں سب — زندگی کا راز داں کوئی نہیں

یہ غزل پورے طور پر بشیر سیفی کی شخصیت کا احاطہ کرتی ہے۔ ایک آدمی اگر ان کی کوئی اور تخلیق نہ پڑھ سکا ہو تو صرف اس غزل کو پڑھ کر یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ بشیر سیفی کے زندگی کرنے کے اطوار، اس سفر میں جو نشیب و فراز حائل ہوئے اور ان کی وجہ سے جن تلخ حقائق اور سرد و گرم زمانے سے وہ گزرے ان کی نوعیت کیا ہے ؟ زندگی گزارنے اور زندگی کرنے میں بڑا فرق ہے۔ بشیر سیفی نے زندگی کی ہے۔ انھیں ان دونوں کے فرق کا ادراک ہے اور اسی ادراک سے ان کی شاعری عبارت ہے۔

غذاب بے زبانی کا ____________ مصنفہ : محسنہ جیلانی

صفحات : ۱۴۳ ۔ قیمت : ۵۰ روپے

پتا : ۲۳ ۔ ہارسٹم ایو ، لندن ۔ این ۔ ۱۲ ۔ یو کے

" عذاب بے زبانی کا " محسنہ جیلانی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں ان کے سولہ افسانے شامل ہیں جو وقتاً فوقتاً اردو کے مؤقر جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

محسنہ جیلانی چوں کہ ایک عرصے سے لندن میں مقیم ہیں اور وہاں آباد اور مقیم ان پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کے مسائل اور اطوارِ زندگی کو قریب سے محسوس کر رہی ہیں جو معاشرتی اعتبار سے دو خانوں میں بٹے نظر آتے ہیں۔ باہر کی معاشرت ان سے جینے کے کچھ اور طریقے چاہتی ہے اور اندرونِ خانہ کی تہذیب کا تقاضا کچھ اور ہے۔ انھوں نے بڑے قرینے اور بڑے مؤثر انداز میں اس دوہرے کلچر کے عذاب کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے جس کا بالخصوص لندن میں مقیم حضرات کو آئے دن سامنا ہے۔ محسنہ جیلانی کے افسانوں میں تازگی، چمک اور نیا پن بھی اسی حوالے سے آیا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ کسی بات کو کہنے کا عمل بڑے اختصار کے ساتھ رونما ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت کسی کی تحریر میں تب پیدا ہوتی ہے جب وہ موضوع

کے پس منظر سے گہری اور قریبی واقفیت رکھتا ہو، اور اس کے احساسات بیدار ہوں۔

محمد جیلانی کا افسانہ "سونے کا پنجرہ" ایسے خاندان کے فرد کی عکاسی کرتا ہے جو ایک عرصے سے لندن میں آباد ہے اور وہاں کے کلچر میں ایسا رنگ گیا ہے کہ اس کے لیے اپنی تو بیاہتا بہو کو جو اس کے بیٹے خیر دین کی عدم توجہی کا دُکھ جھیل رہی ہے۔ یہ کہہ دینا عام بات ہے کہ "میرے کمرے میں سو رہنا۔ اس گھر کی ہر چیز شیئر کی جاتی ہے"

افسانہ "عذاب بے زبانی کا" میں ایک شخص اپنے وطن سے ایک لڑکی بیاہ لاتا ہے۔ وہ لڑکی اپنے شوہر کی خوشنودی کے لیے ہر وہ جگہ جاتی ہے جہاں وہ لے جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ "پب" میں بھی جانے سے گریز نہیں کرتی۔ کئی سال گزرنے کے بعد ایسے ہی ایک پارٹی میں وہ اپنے شوہر کو ایک انگریز لڑکی کے ساتھ کچھ ایسے حال میں دیکھ لیتی ہے کہ اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ پھر دونوں ساتھ گھر آتے ہیں۔ اس کے شوہر کو اپنے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا علم ہے۔ اسے کسی طرح کی صفائی پیش کرنی چاہیے تھی، لیکن خاموش ہے۔ تناؤ کے باوجود ایک مشرقی عورت کے جذبات کس طرح کام کرتے ہیں اور "پتی ورتا" کس طرح ظاہر ہونا چاہتی ہے۔ ان کہاں جملوں میں دیکھیے۔ "میرا دل چاہا تم مجھ سے لڑو، میرے اوپر چیخو، چلاؤ، اپنی صفائی پیش کرو، اپنے بچاؤ کی جھوٹی دلیلیں آزماؤ اور میں یہ دلیلیں سُن کر تمہیں معاف کر دوں، میرے اندر بیٹھی وہ عورت جو صرف تمہیں چاہتی تھی، تمہیں معاف کرنے کو تیار بیٹھی تھی مگر تم نے نہ بولنے کی قسم کھالی تھی۔"

"عذاب بے زبان" ایک قابلِ مطالعہ کتاب ہے اس کے ذریعے اردو کے قارئین معاشرت کے ایک مختلف منطقے سے روشناس ہوتے ہیں۔

پیامِ سحر (شعری مجموعہ) ——— مصنف: مسعود عظیم آبادی

صفحات: ۲۰۸ ـ قیمت: ۳۵ روپے

پتا: اے ۲۹، سیکٹر ۱۱ بی ـ نارتھ کراچی

"پیامِ سحر" مسعود عظیم آبادی کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو ان کی چند سالہ کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص نے صرف ۲½ سال کی ریاضتِ شعر سے ایک ایسا مجموعۂ کلام پیش کر دیا جو صوتی اور معنوی ہر دو اعتبار سے قابلِ داد ہے۔ اس بارے میں افسر ماہ پوری نے بڑی اچھی بات کہی ہے ـ "انھوں نے قطرے سے گہر بننے تک کی ساری منزلیں صرف دو ڈھائی سال کی مدت میں طے کی ہیں اس لیے میں "پیامِ سحر" کو ان کا شعری کارنامہ سمجھتا ہوں۔"

مسعود صاحب کا یہ شعری مجموعہ حمد، نعت، نظم اور غزل پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اس سے پہلے سورہ رحمٰن کا منظوم ترجمہ کیا تھا جو اس کتاب میں شامل ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات اخلاقی، ملّی، مذہبی، اصلاحی اور تعمیری ہیں۔ سماجی مسائل اور معاشرتی نقائص کا بھی ذکر کیا ہے جن کی اصلاح ان کے پیشِ نظر ہے۔ غزل گوئی سے زیادہ ان کا رجحان نظم نگاری کی طرف ہے۔ اصلاحی اور قومی شاعری کرنے والوں کے لیے نظم کا پیمانہ ہی زیادہ کارگر اور سود مند ثابت ہوتا ہے۔ اصلاحی اور مقصدی شاعری کرنے والے کہیں کہیں طنز کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ چناں چہ مسعود عظیم آبادی نے اس حربے کو بھی اپنے اشعار میں خوبی اور کامیابی سے استعمال کیا ہے۔ ان کی اصلاحی اور اخلاقی نظموں میں "میزان"، "پیسہ"، "عرضِ حال"، "امید" اور "امدادِ باہمی" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

(افتخار اجمل شاہین)

گزارش

محبانِ اردو پاکستان

ملک کے جانے پہچانے شاعروں ادیبوں اور محبانِ اردو پاکستان، راولپنڈی، کوہاٹ اور میانوالی کے سربراہوں، سرور انبالوی، محبت خان بنگش اور ابوالمعانی عصری نے مطالبہ کیا ہے کہ اردو زبان کو سرکاری اور رابطے کی زبان بنانے کے لیے ٹھوس اور موثر اقدامات کیے جائیں جو ہماری پوری قوم کی رابطے کی زبان ہے۔

انھوں نے ایک مشترکہ بیان میں کہا کہ راولپنڈی میں حال ہی میں محبانِ اردو پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا ہے جو اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لیے نمایاں کردار ادا کرے گی۔ اس تنظیم میں راولپنڈی سے سرور انبالوی، کوہاٹ سے محبت خان بنگش اور میانوالی سے ابوالمعانی عصری شامل ہیں۔

جس کی شاخیں ملک بھر میں قائم کی جائیں گی جو اردو زبان کی ترویج و ترقی اور فروغ کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کریں گی

مدینۃ الحکمۃ میں ہمدرد اسکول کی تعمیرات

ہمدرد فاؤنڈیشن کے ایک اطلاع نامہ کے مطابق مدینۃ الحکمۃ کی تعمیر کا کام تیز رفتاری سے جاری ہے۔ اس کی مجلسِ منتظمہ مشاورت نے طے کیا ہے کہ ۱۹۸۹ء تک پاکستان کے پانچ ہزار طلبہ و طالبات کے لیے ہمدرد اسکول مکمل ہو جانا چاہیے۔ اس اسکول کا بلاک اے پہلے ہی تیار ہے۔ اس میں طلبہ کی تدریس کے لیے ساٹھ کمرے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق بلاک بی اور سی بھی بارہ مہینے کے اندر تیار ہو جائیں گے۔ یہ دونو بلاک بھی ساٹھ ساٹھ کمروں پر مشتمل ہوں گے۔ اس طرح انگریزی اسکول ۱۸۰ کمروں پر مشتمل ہوگا۔

دو ہزار طلبہ و طالبات کے لیے ہاسٹل کا بھی انتظام ہوگا۔ یہاں پاکستان اور دوسرے ممالک کے دو ہزار نونہالوں کو پرائمری سے اونچے درجے تک کی تعلیم فراہم کی جائے گی۔

عارف عبد المتین اکیڈمی

برصغیر پاک و ہند کے معروف شاعر اور نقاد عارف عبد المتین کی علمی و ادبی خدمات کو عملاً خراجِ تحسین

پیش کرنے کے لیے لاہور میں عارف عبدالمتین اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اکیڈمی عارف صاحب کی شخصیت و فن کے تمام پہلو گوشوں کو اُجاگر کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس سلسلے میں آغازِ کار کے طور پر عارف عبدالمتین کی تین کتابیں شائع کی جا رہی ہیں۔

انجمن ترقی اردو میں جلسۂ سیرت النبیؐ

یکم نومبر مطابق ۱۹ ربیع الاوّل کو انجمن میں جلسۂ سیرت النبیؐ منعقد ہوا۔ پروفیسر محمود حسین رضوی نے سیرتِ رسولؐ پر تقریر فرمائی حافظ کلیم اللہ اور نعیم دہلوی نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔

ادارہ علم و ادب پاکستان کوہاٹ ڈویژن

ادارہ علم و ادب پاکستان، بہزادی چکر کوٹ، کوہاٹ کا قیام ۱۹۸۳ء میں عمل میں لایا گیا تھا۔ اس ادارے کے بانی اور صدر جناب محبت خان بنگش ہیں۔ اس کی ادبی سرگرمیاں بہر نوع نمایاں ہیں۔ حال ہی میں اس ادارے نے ملک کے معروف شاعر اور نامور اہلِ قلم حضرت رضا ہمدانی کی شخصیت و فن پر ایک کتاب شائع کی ہے۔ ان کی دیگر مطبوعات میں شانِ محمد، اشکِ رواں، کانچ کی چوڑیاں، مجلۂ اعلان، سرکارِ دو جہاں، زخمِ خزاں، کوچۂ جاناں وغیرہ ہیں۔

رئیس امروہوی کی یاد میں

گزشتہ دنوں انجمن سادات امروہیہ کے زیرِ اہتمام حضرت رئیس امروہوی کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس کی صدارت انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر جناب نورالحسن جعفری نے فرمائی۔ پروفیسر ممتاز حسین، مختار زمن، ڈاکٹر عالیہ امام، محترمہ شائستہ زیدی، جناب ذاکر علی خاں، جناب منظر علی خاں، جناب رضی احمد صدیقی اور جناب سیّد قمر نے جلسے سے خطاب کیا۔

جناب سیّد محمد تقی نے رئیس صاحب کی موت کو ایک مخلص، محبِ وطن اور انسان دوست شخص کی موت قرار دیا۔ جناب جون ایلیا نے رئیس صاحب کی غزل پڑھ کر سنائی اور ڈاکٹر ہلال نقوی، جناب ممتاز سعید اور غیور احمد نے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ آخر میں صدرِ جلسہ نورالحسن جعفری نے حضرت رئیس امروہوی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ادب و شاعری کے حوالے سے قومی زبان کے سلسلے میں ان کی وسیع تر خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ انھوں نے کہا کہ رئیس صاحب صرف پُرگو شاعر، انشاپرداز اور صحافی ہی نہیں تھے بلکہ علم ہیئت و نجوم اور فلسفہ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کا یہ کارنامہ ہے کہ قطعات کی شکل میں تاریخِ پاکستان مرتّب کر دی ہے۔ پچاس سال بعد یہ قطعات پاکستان کی تاریخ کے سلسلے میں ایک معتبر ماخذ کے کام آسکتے ہیں۔

اس موقع پر معروف مصوّر اقبال مہدی کی بنائی ہوئی رئیس صاحب کی ایک تصویر کی نقاب کشائی بھی کی گئی۔

پروفیسر اختر انصاری دہلوی

پچھلے دنوں اردو کے معروف شاعر، افسانہ نگار و ناقد اختر انصاری دہلوی کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم ۱۹۰۸ء میں بدایوں میں

پیدا ہوئے۔ ان کے والد ڈاکٹر محفوظ اللہ (ریٹائرڈ سول سرجن) دہلی میں آباد ہو گئے تھے۔ اب سے تیس چالیس برس اُدھر ادب و شعر میں جو ان کی شہرت قائم ہوئی سو آخری دم تک قائم رہی۔ ابتداً اُن کے دو افسانوی مجموعے "اندھی دنیا" اور "نانی"، اور ایک شعری مجموعہ "خندۂ سحر" بزرگ اہلِ قلم جناب یوسف بخاری نے مکتبۂ جہاں نما اردو بازار دہلی سے شائع کیا تھا۔ ان کے ابتدائی کلام زیادہ تر "نگار"، "ادبی دنیا"، اور "ہمایوں"، وغیرہ میں شائع ہوتے رہے۔ اردو افسانہ نگاری کے جائزے پر ایک بہت ہی قابلِ قدر کتاب انجمن ترقی اردو پاکستان نے "اردو فکشن" کے نام سے چھاپی ہے جو فنِ افسانہ نگاری کی پرکھ میں اب بھی سنگِ اوّل کا درجہ رکھتی ہے۔

ادارہ ان کی رحلت پر ان کے سوگواروں کے غم میں شریک ہے اور دعاگو ہے کہ پروردگار ان کی مغفرت کرے۔ آمین

اختر انصاری دہلوی کی یاد میں

پروفیسر اختر انصاری دہلوی کے ایصالِ ثواب کے لیے انجمن ترقی اردو پاکستان کے دفتر میں ۱۷ ر اکتوبر ۱۹۸۸ء کو ایک جلسہ منعقد ہوا جلسے میں جناب ادیب سہیل شہزاد منظر اور ڈاکٹر وفا راشدی نے پروفیسر اختر انصاری دہلوی کے فن کا جائزہ لیا اور انھیں بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی معتمد علمی و ادبی نے اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر اختر انصاری کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے شعری اور نثری خدمات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ وہ ہمارے عہد کی منفرد اور یگانہ شخصیت تھے انھوں نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ ادب اور علم کی خدمت میں گزارا۔

فرہنگ اصطلاحاتِ بنکاری اشاعت کے مرحلے میں

۱۹۸۶ء میں انجمن ترقی اردو نے اصطلاحات بنکاری کی دوسری بڑی اور جامع فرہنگ مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے کے لیے اسٹیٹ بنک اور بینکنگ کونسل نے انجمن کے ساتھ مالی تعاون کیا۔ چناں چہ دس ہزار اصطلاحات پر مشتمل یہ فرہنگ تیار کی گئی ہے جس پر نظرثانی کا کام تیزی سے انجام پا رہا ہے۔ اُمید ہے کہ انجمن اپنے اس اہم علمی منصوبے کو جلد از جلد شائع کر دے گی۔ اس فرہنگ کی اشاعت سے قومی زبان میں بنکاری کی مروجہ تمام اصطلاحیں منتقل ہو جائیں گی۔

مولانا امداد صابری کا انتقال

گزشتہ دنوں دہلی کی گزری ہوئی تہذیب کی ایک یادگار، مولانا امداد صابری کا طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً اسّی سال تھی۔ مولانا کا تعلق ان عظیم انقلابیوں میں سے تھا جنھوں نے برطانوی سامراج کے خلاف سیاسی، مذہبی، سماجی اور ثقافتی سطح پر سخت جد وجہد کی تھی۔ وہ ایک سحر انگیز مقرر اور بہت اہم مصنّف تھے۔ انھوں نے اردو میں ساٹھ سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔ مولانا امداد صابری کی خدمات مختلف الجہات تھیں۔

ادارہ "قومی زبان" مولانا کے انتقال پر گہرے رنج کا اظہار کرتا ہے اور دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے اعزا و لواحقین کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

حروفِ تازہ

کتابیں

صلّیِ علیٰ محمدؐ
نعتیہ مجموعہ

مرتّبہ: میر واصف علی
صفحات: ۳۰۲ ۔ قیمت: درج نہیں
پتا: بزمِ قرطاس و علم پاکستان

جمیل مظہری کے مرثیے
مرثیے

مرتّب: ڈاکٹر ہلال نقوی
صفحات: ۲۵۶ ۔ قیمت: ۱۰۰ روپے
پتا: حلقہ فکر و نظر، اے ۲۲، بلاک ۲۰، فیڈرل بی ایریا، کراچی ۳۸

سندھ کا منظر نامہ
سیاسی

مصنّف: شاہد کامرانی
صفحات: ۵۱۲ ۔ قیمت: ۲۰۰ روپے
پتا: مکتبہ فکر و دانش ۹۱۵ ۔ یونی پلازہ، آئی آئی چندریگر روڈ کراچی

شاد عظیم آبادی
ایک تحقیقی جائزہ

مصنّف: ڈاکٹر طاہر حسین رضوی نگرامی
صفحات: ۲۰۶ ۔ قیمت: درج نہیں
پتا: بی ۴/۶۱ ملیر توسیعی کالونی ۔ کراچی ۳۷

لوحِ خاک
شاعری

مصنّف: احمد ندیم قاسمی
صفحات: ۲۲۳ ۔ قیمت: ۹۰ روپے
پتا: اساطیر ۔ ۴ ۔ میکلوڈ روڈ، لاہور

ہتھیلیوں پہ چراغ
شاعری

مصنّف: خالد احمد
صفحات: ۲۷۲ ۔ قیمت: ۱۰۰ روپے
پتا: پاکستان بکس اینڈ لیٹریری ساؤنڈز لاہور

لو اور سنو
طنزیہ شاعری

مصنّف: گستاخ گیاوی
صفحات: ۱۸۸ ۔ قیمت: ۲۵ روپے
پتا: خورشید پبلشرز ۵ نیو اردو بازار، کراچی

ستم ظریف
مزاحیہ مضامین

مصنف: مشکور حسین یاد

صفحات: ۲۱۰ ـ قیمت: ۶۰ روپے

پتا: مکتبہ القریش اردو بازار، لاہور

غالب کی زمینوں میں پچیس سلام
سلام

مصنفہ: تصویر فاطمہ

صفحات: ۶۳ ـ قیمت: ۲۰ روپے

پتا: حلقہ فکر و نظر، اے ـ ۶۲، بلاک ۲۰ فیڈرل بی ایریا، کراچی ۳۸

رمزِ حسن
شاعری

مصنف: شاہد نجیب آبادی

صفحات: ۲۰۳ ـ قیمت: درج نہیں

پتا: ادب منزل ـ یو، ۵۰ بلاک ۲ ـ پی ای سی ایچ سوسائٹی، کراچی

ہمارا ادبی و فکری سفر
تنقید

مصنف: جیلانی کامران

صفحات: ۲۵۴ ـ قیمت: ۶۰ روپے

پتا: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲ ـ کلب روڈ، لاہور

طبقاتی جدوجہد اور بنیاد پرستی
تنقید

مصنف: شوکت صدیقی

صفحات: ۲۴۰ ـ قیمت: ۶۰ روپے

پتا: کتاب پبلی کیشنز، پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۳۳، کراچی

فیض احمد فیض
تنقید

مرتبہ: شاہد ماہلی

صفحات: ۴۱۶ ـ قیمت: ۹۰ روپے

پتا: ماورا پبلشرز ـ ۳ ـ بہاولپور، لاہور

رسوا ـ ایک مطالعہ
تحقیق

مرتب: ڈاکٹر میمونہ انصاری

صفحات: ۴۸۸ ـ قیمت: ۱۵۰ روپے

پتا: مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۲

تلخاب
شاعری

ڈاکٹر خیال امروہوی

ـ قیمت: ۶۰ روپے

پتا: مکتبہ میری لائبریری، لاہور ـ ۲

تاریخ میں کیا ہوا؟
تاریخی جائزے

مصنف: گورڈن چائلڈ، مترجم: ڈاکٹر ظفر عارف

صفحات: ۳۱۹ ـ قیمت: ۷۰ روپے، مجلد ـ ۱۰۰ روپے

پتا: کراچی اسٹڈی سرکل ۴۷۵/۱۶ ـ فیڈرل بی ایریا کراچی

ابر، بارش، ہوا — مصنف: نیاز حسین لکھویرا
شاعری
صفحات: ۱۲۸ — قیمت: ۲۰ روپے
پتا: ماورا پبلشرز — ۳۔ بہاولپور روڈ، لاہور۔

تذکرہ سنکیانگ — مصنف: بریگیڈیر گلزار احمد
سفرنامہ
صفحات: ۱۸۲ — قیمت: ۱۰ روپے
پتا: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ — ۲ کلب روڈ، لاہور

جریدے

ابلاغ، شمارہ ۲ — مرتبین: سیدہ حنا، نسرین شردس
صفحات: ۸۴ — قیمت:
پتا: احمد سلمان پبلی کیشنز ۱۰۴۲/ ٹی، یوسف آباد ولزاک روڈ پشاور

غالب نامہ — مدیر: پروفیسر نذیر احمد
ادبی مجلّہ
صفحات: ۲۸۸ — قیمت: ۴۰ روپے
پتا: ایوانِ غالب مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

کاروان — مرتبین: پروفیسر سمیع اللہ قریشی، ابوبکر صدیقی، حسن محمود اقبال
ادبی مجلّہ
صفحات: ۱۴۸ — قیمت: درج نہیں
پتا: گورنمنٹ کالج، جھنگ

فکر و نظر — مدیر: صاحبزادہ ساجد الرحمٰن
علمی و ادبی مجلّہ
صفحات: ۱۱۴ — قیمت: ۱۰ روپے
پتا: ادارہ تحقیقاتِ اسلامی — اسلام آباد

افکار — مدیر: صہبا لکھنوی
ماہنامہ
صفحات: ۸۴ — قیمت: ۶ روپے
پتا: افکار فاؤنڈیشن رابسن روڈ — کراچی

نگار — مدیر: ڈاکٹر فرمان فتح پوری
ماہنامہ
صفحات: قیمت:
پتا:

نومبر ۱۹۸۷ء تا جون ۱۹۸۸ء کے رسائل کا موضوع وار اشاریہ

نئے خزانے

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

ادبی شخصیات

بشیر ساجد	ذکی تراکانی کی غزل گوئی	سیارہ،	لاہور،	اشاعت ۲۵	۱۹۸۷ء ص ۸۸
بشیر سیفی، ڈاکٹر	شاہد احمد دہلوی، بطور خاکہ نگار	〃	〃	مئی، جون	۱۹۸۸ء ص ۸۸
تاج بیگم	بسم اللہ آپا	قومی زبان،	کراچی	مارچ	〃 ص ۱۶
تاراچند رستوگی، ڈاکٹر	جگن ناتھ آزاد ـ ایک صوری جائزہ	سب رس،	〃	اپریل	〃 ص ۲۰
تسنیم مینائی	ماہر القادری کا ایک شعر	فاران،	〃	مارچ	〃 ص ۵۱
توکّل حسین قدوائی	دلّی کی آخری شمع	انجمن،	〃	جون	〃 ص ۲۶
جعفر بلوچ	راجہ محمد عبداللہ نیاز ـ شخص و شاعر	سیارہ،	لاہور	مئی، جون	〃 ص ۵۶
جمیل جالبی، ڈاکٹر	سلیم احمد اور نثری نظم ـ	نیرنگِ خیال،	راولپنڈی	ستمبر	۱۹۸۷ء ص ۲۰
جمیل جالبی، ڈاکٹر	یادِ رفتگاں ـ جمیلہ ہاشمی	قومی زبان،	کراچی	مارچ	۱۹۸۸ء ص ۷
جمیل زبیری	پروفیسر حامد حسن قادری	〃	〃	جون	〃 ص ۵۷
جمیل ملک	شہرِ شب کا صدا کار ـ پیر اکرم	فنون،	لاہور	نومبر/دسمبر	۱۹۸۷ء ص ۱۹۶
حامد بیگ، ڈاکٹر مرزا	میر امّن دلّی والے	نقوش،	〃	شمارہ ۱۳۶	〃 ص ۳۳۴
حسن مثنیٰ ندوی	شاعرِ انقلاب ـ مومن خاں مومن	دائرے،	کراچی	مئی	۱۹۸۸ء ص ۶۶
حسن ناصر	سرگزشتِ حالی	طلوعِ افکار،	〃	اکتوبر/نومبر	〃 ص ۵۰
خورشید احمد گیلانی	احسان دانش مرحوم	چٹان،	لاہور	۳۱ مارچ	〃 ص ۴۰
دانش، ن ـ م	مولانا حالی اور اردو غزل	قومی زبان،	کراچی	فروری	〃 ص ۵۳
راحت علی ہاشمی، مولانا	عطاء اللہ خاں عطاء اور ان کی شاعری	الاشرف،	〃	جنوری	〃 ص ۵۹
راشد اسدی،	سخن ورانِ جے پور	سب رس،	〃	دسمبر	۱۹۸۷ء ص ۲۵

رشید محمود، راجا	اردو کے صاحب کتاب نعت گو	نعت،	لاہور	جون	۱۹۸۸ء	ص ۵
زبیر فاروقی	جگر کی شاعری	انجمن،	کراچی	جنوری	〃	ص ۱۳
سحر انصاری	شبلی کا اسلوب تنقید	دائرے	〃	مارچ	〃	ص ۳۱
سرور اکبر آبادی، ڈاکٹر	امیر مینائی کی نعتیہ شاعری	انجمن،	〃	〃	〃	ص ۱۲
سرور اکبر آبادی، ڈاکٹر	علامہ سیماب اکبر آبادی	〃	〃	جنوری	〃	ص ۲۵
سرور اکبر آبادی، ڈاکٹر	پروفیسر حامد حسن قادری	〃		اپریل	〃	ص ۳۴
سعید الرحمٰن، مولانا	علامہ شرف الدین محمد بن سعید بوصیری	سہ ماہی محراب و منبر		جنوری	〃	ص ۶
شاعر، حمایت علی	نئی طرز فکر کا پہلا شاعر	دائرے،	کراچی	اپریل	〃	ص ۱۳
شاعر، پروفیسر حمایت علی	اختر الزماں ناصر	سب رس،	〃	جنوری	〃	ص ۱۸
شاہین مفتی	انور مسعود کی قطع کلامی	فنون،	لاہور	نومبر	۱۹۸۷ء	ص ۱۸۳
شفقت رضوی، پروفیسر	چودھری دلّو رام کوثری	سب رس،	کراچی	جنوری	۱۹۸۸ء	ص ۱۱
شمس الرحمٰن فاروقی	ذوق کی غزل	دائرے،	〃	مئی	〃	ص ۲۱
شمیم صبائی متھراوی	سنہ ستاسی میں جدا ہو گئے ہم سے یہ لوگ	قومی زبان،	〃	فروری	〃	ص ۶۷
		〃	〃	مارچ	〃	ص ۹۳
		〃	〃	اپریل	〃	ص
		〃	〃	مئی	〃	ص ۸۱
شورش کاشمیری مرحوم، آغا	مولانا عبد الماجد دریا بادی	چٹان،	لاہور	۲۶ فروری	〃	ص ۳۲
شوکت واسطی	ہمارے ادبی اکابرین	نیرنگ خیال	راولپنڈی	ستمبر	۱۹۸۷ء	ص ۳۷
شہزاد منظر	فراق — عسکری کی نظر میں	سیارہ،	لاہور — اشاعت ۲۵		〃	ص ۷۱
	عارف نوشاہی	سیارہ،	لاہور،	اشاعت ۲۵	۱۹۸۷ء	ص ۷۱
ضیاء بہاء الحق	محمد خالد اختر — فن اور شخصیت	قومی زبان،	کراچی	مارچ	۱۹۸۸ء	ص ۳۹
ظفر الحسن، مرزا	قاضی عبد الغفار (غیر مطبوعہ شخصی خاکہ)	غالب،	〃	۱، ۲	〃	ص ۲۷۲
عالی، جمیل الدین	ایک خادم ادب — مسلسل رت جگے	قومی زبان،	〃	مئی	〃	ص ۲۲
عبد اللہ شاہ	مشتاق یوسفی کی مزاح نگاری	سیارہ،	لاہور	مئی، جون	〃	ص ۹۱
عبد المغنی، پروفیسر	علامہ شبلی کی تنقید نگاری	معارف،	اعظم گڑھ	مئی	〃	ص ۳۲۵
عطا کاکوی، پروفیسر شاہ عطاء الرحمٰن	مرزا عبد القادر بیدل	جرنل،	پٹنہ		۱۹۸۷ء	ص ۱
عطاء الحق قاسمی	اقبال ساجد کی وفات پر ایک عجیب و غریب شخص کا نوحہ	سیارہ،	لاہور	مئی، جون	۱۹۸۸ء	ص ۴۱۱

عقیل، ڈاکٹر معین الدین	فروغ بادۂ اقبال — ماہر القادری	سیارہ،	لاہور	مئی، جون ۱۹۸۸ء ص ۱۶۲
علی رضا، سید	صالحہ عابد حسین	قومی زبان،	کراچی	مارچ 〃 ص ۱۱
فاطمہ عالم	آغا حیدر حسن مرزا	سب رس،	〃	جنوری 〃 ص ۳۴
فدا، سید حسین شاہ پروفیسر	حضرت امیر خسرو دہلوی	الشمس،	ملتان	۱۴ر جون تا ۲۷ جون 〃 ص ۳
فراق گورکھپوری	میرانظریۂ شاعری	طلوع افکار،	کراچی	دسمبر ۱۹۸۷ء ص ۵
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر	عطا شاد — شاعرِ آتش نہاد	فنون،	لاہور	نومبر، دسمبر 〃 ص ۱۶۲
فریدہ عفت	سجاد حیدر یلدرم رومانیت کے آئینے میں	سب رس،	کراچی	اپریل ۱۹۸۸ء ص ۴۰
قمر جمیل	راشد مفتی اور "واسوخت"	فنون،	لاہور	نومبر، دسمبر ۱۹۸۷ء ص ۱۸۷
کبیر خان، محمد	احمد ندیم قاسمی عالمی سیمینار	قومی زبان،	کراچی	مئی ۱۹۸۸ء ص ۳۱
کرار حسین	سچا شاعر	دائرے،	〃	〃 〃 ص ۱۱
کشفی، سید ابوالخیر	ہند کتھا	〃	〃	اپریل 〃 ص ۷۸
کلیم اختر	محبِ اردو — خوشتر گرامی	چٹان،	لاہور	۱۸ر فروری 〃 ص ۳۳
گیان چند، ڈاکٹر	قاضی عبدالودود اور میں	غالب،	کراچی	۲،۱ 〃 ص ۲۹۲
محمد اسلم، پروفیسر	حضرت امیر مینائی شیعہ نہیں تھے	خدام الدین،	لاہور	۲۹ر اپریل 〃 ص ۱۹
محمد ذہین عالم خاں سروہا	درویش دانشور	قومی زبان،	کراچی	فروری 〃 ص ۴۹
محمد رابع حسنی ندوی	سید صباح الدین عبدالرحمٰن رح	تعمیرِ حیات،	لکھنؤ	۱۰ر دسمبر ۱۹۸۷ء ص ۳
محمد طفیل	ایک خوب صورت انسان (مرزا ادیب)	نقوش،	لاہور	شمارہ نمبر ۱۳۶ دسمبر 〃 ص ۶۲۸
محمد طفیل	عظمت شیخ (ایک خاکہ)	〃	〃	〃 〃 〃 〃 ص ۷۸۵
محمود الرحمٰن، ڈاکٹر	سردار عبدالرب نشتر بہ حیثیت شاعر	الہام،	بہاولپور	۲۸ر فروری ۱۹۸۸ء ص ۵
مسلم شمیم	قمر کی شاعری کی فکری اساس	طلوع افکار،	کراچی	دسمبر ۱۹۸۷ء ص ۱۸
مظفر عباس، ڈاکٹر	فرحت اللہ بیگ اور "دلی کی آخری شمع"	المعارف،	لاہور	جولائی، اگست 〃 ص ۱۵۵
مشرف احمد	شوکت صدیقی	دائرے،	کراچی	جنوری ۱۹۸۸ء ص ۴۳
مشرف احمد	ممتاز حسین	〃	〃	فروری 〃 ص ۸۲
مشرف احمد	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	〃	〃	مارچ 〃 ص ۶۳
منظور الٰہی، شیخ	ابنِ حسن برنی	نقوش،	لاہور	شمارہ ۱۳۶ دسمبر ۱۹۸۷ء ص ۷۴۶
نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر	سراج اورنگ آبادی پر نئی روشنی	〃	〃	〃 〃 〃 〃 ص ۴۶
نجمی، سلمیٰ یاسین	منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی	سیارہ،	〃	اشاعت ۲۵ 〃 ص ۲۹۲

ندیم، صلاح الدین	آغا شورش کاشمیری	چٹان،	لاہور	۱۴ر اپریل ۱۹۸۸ء	ص ۱۴
نسیم یوسفزئی	ٹی ایس ایلیٹ	دائرے،	کراچی	مئی	ص ۸۹
〃	گارسیا مارکیز	〃	〃	جنوری	ص ۹۲
〃	یوجین اونل۔ نوبل انعام یافتہ ڈرامہ نگار	〃	〃	فروری	ص ۱۰۸
〃	ولیم گولڈنگ	〃	〃	اپریل	ص ۸۳
〃	رول سونیکا۔ نوبل انعام یافتہ افریقی ڈرامہ نگار	〃	〃	جون	ص ۹۵
نظر صدیقی	سرور بارہ بنکوی	فنون،	لاہور	نومبر، دسمبر ۱۹۸۷ء	ص ۱۹۱
〃	ڈاکٹر عندلیب شادانی اور ان کے بعض معاصرین	غالب،	کراچی	۲۰۱ ۱۹۸۸ء	ص ۲۱۸
نظیر صدیقی	شادانی کی بدیہہ گوئی	دائرے،	〃	فروری	ص ۵۸
نکہت بریلوی	حمایت علی شاعر۔ ایک تاثر	〃	〃	جون	ص ۸۰
نگہت جمال۔ آسنہ	محمد ہادی حسین	سیارہ،	لاہور	اشاعت ۲۵ ۱۹۸۷ء	ص ۷۹
نیر مسعود، ڈاکٹر	میر اور خانِ آرزو	قومی زبان،	کراچی	جون ۱۹۸۸ء	ص ۴۵
وجیہہ الدین حمد	سرگزشتِ میراجی	سب رس،	〃	دسمبر ۱۹۸۷ء	ص ۱۰
وحید انور	زندگی کی ایک شام خواجہ احمد عباس کے نام	نقوش،	لاہور	شمارہ نمبر ۱۳۶ دسمبر ۱۹۸۷ء	ص ۳۷
وفا راشدی، ڈاکٹر	علامہ سیماب اور ان کا عہد	طلوعِ افکار،	کراچی	دسمبر ۱۹۸۷ء	ص ۱۲
وفا راشدی، ڈاکٹر	مولانا عبدالواحد سندھی	قومی زبان،	〃	مارچ ۱۹۸۸ء	ص ۲۱
یوسف ناظم	مرزا ظفر الحسن	غالب،	〃	۲۰۱	ص ۲۶۷
ــــــــ	پیر غلام محی الدین شاہ بابوجی	چٹان،	لاہور	۲۱ر جنوری	ص ۲۴

تاریخی و سیاسی شخصیات

قائدِ اعظم

رشید اشرف ندوی	قائدِ اعظم محمد علی جناح اور مجاہدینِ پاکستان	استقلال،	لاہور	۲۴ر دسمبر ۱۹۸۷ء	ص
سعید قادری	قائدِ اعظم	〃	〃	〃	ص ۱۸
غوث علی شاہ، سید	قائدِ اعظم محمد علی جناح	چٹان،	〃	۲۹ر تا ۴ر جنوری ۱۹۸۸ء	ص ۱۵
محمد نعیم عادفی	قائدِ اعظم اور اسلام	تکبیر،	کراچی	۷ر جنوری	ص ۱۵

Regd. M. No. 270 Phone: 724023

Monthly **QAUMI ZABAN** Karachi

انجمن کی مجوزہ عمارت کا نقشہ

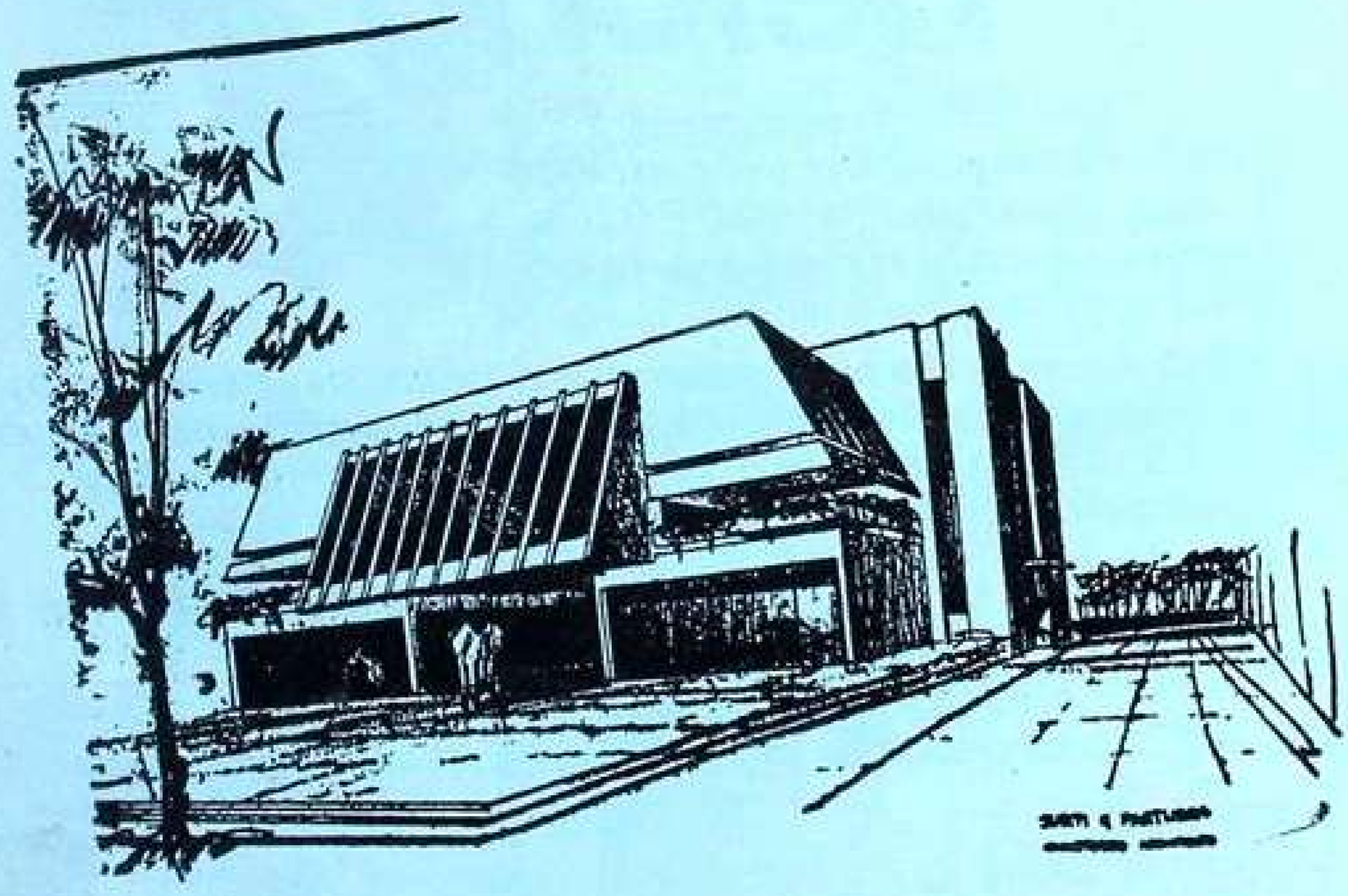

ایک خواب

جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے ہر پاکستانی کے تعاون کی ضرورت ہے

مدیر :- ادیب سہیل کلیم الحسن نقوی کے زیر اہتمام انجمن پریس کراچی میں چھپ کر
انجمن ترقی اردو (پاکستان) - بابائے اردو روڈ - کراچی سے شائع ہوا -